جلد (۸) عدد (۵)
جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ ہجری

رجسٹرڈ نمبر آصفیہ ۱۲۰
رجسٹرڈ نمبر ایم ن ۳۹۵۰

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علومِ قرآنی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (عہ)
قیمت فی پرچہ ۸ر

الجہاد فی الاسلام

(تالیف)

ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام کے جن مسائل پر مخالفین نے سب سے زیادہ حملے کیے ہیں اُن میں سے ایک مسئلہ جہاد بھی ہے اس مسئلہ پر ایسی شدومد کے ساتھ اعتراضات کیے گئے کہ بہت سے مسلمان بھی ان سے مرعوب ہو گئے اور انہوں نے دشمنوں کے اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے خود اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات میں قطع وبرید شروع کر دی۔ اسلام کے حامیوں کی جانب سے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا وہ سب معذرت Apology کے انداز میں تھا جس سے صریح کمزوری اور مرعوبیت ظاہر ہوتی تھی۔ مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد نے البتہ اس مسئلہ کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر پورا پورا حق ان کی تحریروں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی جاتی جس میں جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم اور اس کے مقاصد اور احکام کو تفصیل کے ساتھ صاف صاف بیان کر دیا جاتا، اور دوسرے مذاہب اور قوموں کے اصول وقوانین جنگ سے مقابلہ کر کے ثابت کیا جاتا کہ اسلام کا جہاد اپنے مقاصد اور قواعد وضوابط کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

الجہاد فی الاسلام نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب معذرت کے انداز میں نہیں بلکہ اظہار حق کے انداز میں لکھی گئی ہے اور ضمناً اس میں ہندو مذہب، بودھ مت، مسیحیت، یہودیت اور قانون بین الاقوام International law پر ایسے مباحث بھی آگئے ہیں جو ابھی تک اردو زبان کے لیے بالکل نئے ہیں عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب صرف اردو بلکہ کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

ضخامت (۵۰۰) صفحات قیمت غیر مجلد [illegible] انگریزی ([illegible]) سکہ عثمانیہ (مجلد کی قیمت [illegible] سکہ انگریزی [illegible] سکہ عثمانیہ)

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے (یہ کتاب مکتبہ علمیہ چارمینار سے بھی مل سکتی ہے)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

مسلم یونیورسٹی کورٹ نے اپنے گذشتہ سالانہ اجلاس (منعقدہ ۱ اپریل ۱۹۳۶ء) میں ایک ایسے اہم مسئلہ کی طرف توجہ کی ہے جو ایک عرصہ سے توجہ کا محتاج تھا، یعنی دینیات اور علوم اسلامیہ کے ناقص طرز تعلیم کی اصلاح اور یونیورسٹی کے طلبہ میں حقیقی اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کی ضرورت۔ جہاں تک جدید علوم و فنون اور ادبیات کی تعلیم کا تعلق ہے حکومت کی قائم کی ہوئی یونیورسٹیوں میں اس کا بہتر سے بہتر انتظام موجود ہے، کم از کم اتنا ہی بہتر جتنا خود علی گڑھ میں ہے۔ محض اس غرض کے لیے مسلمانوں کو اپنی ایک الگ یونیورسٹی قائم کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ ایک مستقل قومی یونیورسٹی قائم کرنے کا تخیل جس بنا پر مسلمانوں میں پیدا ہوا، اور جس بنا پر اس تخیل کو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ صرف یہ ہے کہ مسلمان جدید علوم سے استفادہ کرنے کے ساتھ "مسلمان" بھی رہنا چاہتے ہیں۔ یہ غرض سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں سے پوری نہیں ہوتی۔ اسی کے لیے مسلمانوں کو اپنی ایک اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت ہے۔ اگر ان کی اپنی یونیورسٹی بھی یہ غرض پوری نہ کرے، اگر وہاں سے بھی ویسے ہی گریجویٹ نکلیں جیسے سرکاری یونیورسٹیوں سے نکلتے ہیں، اگر وہاں بھی محض "دیسی صاحب لوگ" یا ہندی وطن پرست یا اشتراکی ملاحدہ پیدا ہوں، تو لاکھوں روپیہ کے صرف سے

ایک یونیورسٹی قائم کرنے اور چلانے کی کونسی خاص ضرورت ہے؟

یہ ایسا سوال تھا جس پر ابتدا ہی میں کافی توجہ کرنے کی ضرورت تھی جب یونیورسٹی قائم کی جا رہی تھی اس وقت سب سے پہلے اسی بات پر غور کرنا چاہیے تھا کہ ہم کو ایک علیٰحدہ یونیورسٹی کی کیا ضرورت ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کی کیا سبیل ہے؟ مگر کسی نقاد نے آج کل کے مسلمانوں کی تعریف میں شائد سچ ہی کہا ہے کہ یہ کام پہلے کرتے ہیں اور سوچتے بعد میں ہیں۔ جن لوگوں کو یونیورسٹی بنانے کی دھن تھی انھیں بس یونیورسٹی ہی بنانے کی دھن تھی، اس کا کوئی نقشہ ذہن میں نہ تھا۔ یہ سوال سرے سے پیش نظر ہی نہ تھا کہ ایک "مسلم" یونیورسٹی کیسی ہونی چاہیے اور کن خصوصیات کی بنا پر کسی یونیورسٹی کو "مسلم یونیورسٹی" کہا جا سکتا ہے۔ اس عمل بلا فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ بس ویسی ہی ایک یونیورسٹی علیگڈھ میں بھی قائم ہوگئی جیسی ایک آگرہ میں اور دوسری لکھنؤ میں اور تیسری ڈھاکہ میں ہے۔ لفظ "مسلم" کی رعایت سے کچھ دینیات کا حصہ بھی نصاب میں شریک کر دیا گیا۔ تاکہ جب کوئی دریافت کرے کہ اس یونیورسٹی کے نام میں لفظ "مسلم" کیوں رکھا گیا ہے تو اس کے سامنے قدوری اور منیۃ المصلی اور ہدایہ بطور سندِ اسلامیت پیش کر دی جائیں۔ مگر درحقیقت یونیورسٹی کی تاسیس و تشکیل میں کوئی ایسی خصوصیت پیدا نہیں ہوئی جس کی بنا پر وہ دوسری سرکاری یونیورسٹیوں سے ممتاز ہو کر حقیقی معنوں میں ایک "اسلامی یونیورسٹی" ہوتی۔

ممکن ہے کہ ابتدا میں تعمیر کے شوق اور جوش نے صحیح اور مناسب نقشہ پر غور کرنے کی مہلت نہ دی ہو لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یونیورسٹی قائم ہوئے پندرہ سال ہو گئے اور اس دوران

میں ہمارے تعلیمی ناخداؤں نے ایک مرتبہ بھی یہ محسوس نہیں کیا کہ ان کی اصلی منزل مقصود کیا تھی اور ان کا راہ رو پشت بمنزل کدھر جا رہا ہے۔ ابتدا سے حالات صاف بتا رہے ہیں کہ یہ درسگاہ نہ اس ڈھنگ پر چل رہی ہے جس پر ایک اسلامی درسگاہ کو چلنا چاہیے اور نہ وہ نتائج پیدا کر رہی ہے جو دراصل مطلوب تھے۔ اس کے طلبہ اور ایک سرکاری یونیورسٹی کے طلبہ میں کوئی فرق نہیں۔ اسلامی کیرکٹر، اسلامی اسپرٹ، اسلامی طرز عمل مفقود ہے۔ اسلامی تفکر اور اسلامی ذہنیت ناپید ہے۔ ایسے طلبہ کی تعداد شائد ایک فی صدی بھی نہیں جو اس یونیورسٹی سے ایک مسلمان کی سی نظر اور مسلمان کا سا نصب العین لے کر نکلے ہوں اور جن میں یونیورسٹی کی تعلیم و تربیت نے یہ قابلیت پیدا کی ہو کہ اپنے علم اور اپنے قوائے عقلیہ سے کام لے کر ملت اسلامیہ میں زندگی کی کوئی نئی روح پھونک دیتے، یا کم از کم اپنی قوم کی کوئی قابل ذکر علمی و عملی خدمت ہی انجام دیتے۔ نتائج کی نوعیت اگر محض سلبی ہی رہتی تب بھی غنیمت ہوتا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل اور زیر تعلیم طلبہ میں ایک بڑی تعداد ایسے نوجوانوں کی پائی جاتی ہے جن کا وجود اسلام اور اسلامی تہذیب اور مسلمان قوم کے لیے نفع نہیں بلکہ الٹا نقصان ہے یہ لوگ روح اسلامی سے ناآشنا ہی نہیں بلکہ اس سے قطعاً منحرف ہو چکے ہیں۔ ان میں مذہب کی طرف سے صرف سرد مہری ہی نہیں بلکہ نفرت سی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے ذہن کا سانچہ ایسا بنا دیا گیا ہے کہ وہ تشکیک کی حد سے گذر کر انکار کے مقام پر پہنچ گئے ہیں، اور ان اصول اولیہ کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں جن پر اسلام کی بنیاد قائم ہے۔

حال میں خود مسلم یونیورسٹی کے ایک فارغ التحصیل نوجوان نے جو محض اپنی سلامت طبع کی وجہ سے "مرتد" ہوتے ہوتے رہ گئے، اپنے ایک پرائیویٹ خط میں وہاں کے حالات

کی طرف چند ضمنی اشارات کیے ہیں۔ یہ خط اشاعت کے لیے نہیں ہے، اور نہ خصوصیت کے ساتھ علیگڈھ کی کیفیت بیان کرنے کے لیے لکھا گیا ہے، اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ یونیورسٹی کی باطنی کیفیت کا نہایت صحیح مرقع ہے۔ صاحب خط نے خود اپنے ذہنی ارتقار کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"علی گڈھ میں مجھے اسلامی دنیا کے خارجی فتنے یعنی تفریخ کی آخری ارتقائی شکل یعنی کمیونزم سے دوچار ہونا پڑا۔ میں پہلے مغربیت کو کوئی خطرناک چیز نہ سمجھتا تھا لیکن علیگڈھ کے تجربات نے مجھے حقیقت سے روشناس کرادیا۔ اسلامی ہند کے اس مرکز میں ایک خاصی تعداد ایسے افراد کی موجود ہے جو اسلام سے مرتد ہوکر کمیونزم کے پرجوش مبلغ بن گئے ہیں۔ اس جماعت میں اساتذہ میں سے کافی لوگ شامل ہیں۔ اور یہ اساتذہ تمام ذہین اور خوش رو نوجوان طلبہ کو اپنے جال میں پھانستے ہیں۔ ان لوگوں نے کمیونزم اس لیے اختیار نہیں کیا کہ وہ غریبوں اور کسانوں اور مزدوروں کی حمایت اور امداد کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ ان کی عملی مسرفانہ زندگیاں ان کی بناوٹی باتوں پر پانی پھیر دیتی ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ وہ ایک عالمگیر تحریک کے سایہ میں اپنی اخلاقی کمزوریوں اور اپنے ملحدانہ رجحانات طبع اور اپنی Loose-thinking کو Justify کرسکیں۔ کمیونزم نے پہلے مجھے بھی دھوکہ دیا۔ میں نے خیال کہ یہ اسلام ہی کا ایک Unauthorised Edition ہے لیکن بغور مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اسلام کے اور اس کے بنیادی نصب العین میں زمین وآسمان کا فرق ہے"۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی تعلیم و تربیت صرف ناقص ہی نہیں ہے، بلکہ ان مقاصد کے بالکل برعکس نتائج پیدا کر رہی ہے جن کے لیے سید احمد خاں

اور محسن الملک اور وقار الملک نے ایک مسلم یونیورسٹی کا خواب دیکھا تھا اور جن کے لیے مسلمانوں نے اپنی بساط سے بڑھ کر جوش و خروش کے ساتھ اس خواب کی عملی تعبیر کا خیر مقدم کیا تھا۔

آپ اُس انجنیر کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے جس کی بنائی ہوئی موٹر آگے چلنے کے بجائے پیچھے کی جانب دوڑتی ہو؟ اور وہ انجنیر آپ کی نگاہ میں کیسا ماہر فن ہوگا جو اپنی بنائی ہوئی موٹر کو مسلسل اور پیہم الٹی حرکت کرتے دیکھتا رہے اور پھر بھی محسوس نہ کرے کہ اس کے نقشے میں کوئی خرابی ہے؟ غالباً ان صفات کا کوئی میکانیکل انجنیر تو آپ کو نہ مل سکے گا، لیکن آپ کی قوم کے تعلیمی انجنیر جس درجہ کے ماہر فن ہیں اس کا اندازہ آپ اس امر واقعہ سے کر لیجیے کہ وہ ایک ایسی تعلیمی مشین بنانے بیٹھے تھے جس کو اسلامی نصب العین کی جانب حرکت دینا مقصود تھا، مگر جو مشین انہوں نے بنائی وہ بالکل جانبِ مخالف میں حرکت کرنے لگی، اور مسلسل پندرہ سال تک حرکت کرتی رہی، اور ایک دن بھی ان کو محسوس نہ ہوا کہ ان کے نقشہ تعمیر میں کیا غلطی ہے، بلکہ کوئی غلطی ہے بھی یا نہیں۔

بعد از خرابی بسیار اب یونیورسٹی کورٹ کو یاد آیا ہے کہ :-

"مسلم یونیورسٹی کے مقاصدِ اوّلیہ میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے طلبہ میں اسلامی روح پیدا کرے"

اور اس غرض کے لیے اس نے سات اشخاص کی ایک کمیٹی مقرر کی ہے جس کے سپرد یہ خدمت کی گئی ہے کہ :-

"تمام صورت حال کا جائزہ لے اور دینیات، علوم اسلامیہ کی تعلیم کے لیے ایسے جدید اور ترقی یافتہ ذرائع اختیار کرنے کی سفارش کرے جو ضروریات زمانہ سے مناسبت رکھتے ہوں اور جن سے اسلامی تعلیمات کو زیادہ اطمینان بخش طریق پر پیش کیا جا سکے۔

بڑی خوشی کی بات ہے۔ نہایت مبارک بات ہے۔ صبح کا بھولا اگر شام کو واپس آجائے تو اسے بھولا ہوا نہیں کہتے۔ اگر اب بھی ہمارے تعلیمی انجینیروں نے یہ محسوس کرلیا ہو کہ ان کی تعلیمی مشین غلط نقشے پر بنی ہے اور اپنے مقصد ایجاد کے خلاف اس کے چلنے کی اصلی وجہ محض بخت و اتفاق نہیں بلکہ نقشۂ تاسیس و تشکیل کی خرابی ہے تو ہم خوشی کے ساتھ یہ کہنے کے لیے تیار ہیں کہ مضیٰ ما مضیٰ، اُؤ۔ اب اپنے پچھلے نقشے کی غلطیوں کو سمجھ لو اور ایک صحیح نقشہ پر اس مشین کو مرتب کرو۔ لیکن ہمیں شبہ ہے کہ اب بھی اپنی غلطی کا کوئی صحیح احساس ان حضرات میں پیدا نہیں ہوا ہے۔ ابھی تک وہ اس امر کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ان کے نقشے میں کوئی بنیادی خرابی ہے۔ محض نتائج کی خوفناک ظاہری صورت ہی سے وہ متأثر ہوئے ہیں، اور بالکل سطحی نگاہ سے حالات کو دیکھ رہے ہیں۔

خدا کرے کہ ہمارا یہ شبہ غلط ہو۔ مگر پچھلے تجربات ہم کو ایسا ہی شبہ کرنے پر مجبور کررہے ہیں۔

پچھلی صدی کے وسط میں جب دو صدیوں کا پیہم انحطاط ایک خوفناک سیاسی انقلاب پر منتہی ہوا تھا اس وقت مسلمانوں کے ڈوبتے ہوئے بیڑے کو سنبھالنے کے لیے پردۂ غیب سے چند ناخدا پیدا ہو گئے تھے۔ وہ وقت زیادہ غور و خوض کا نہ تھا۔ یہ سوچنے کی مہلت ہی کہاں تھی کہ اس شکستہ جہاز کے بجائے ایک نیا اور پائیدار جہاز کس نقشے پر بنایا جائے۔ اس وقت تو صرف یہ سوال درپیش تھا کہ یہ قوم جو ڈوب رہی ہے اس کو ہلاکت سے کیونکر بچایا جائے۔ ناخداؤں میں سے ایک گروہ نے فوراً اپنے اُسی پرانے جہاز کی مرمت شروع کردی، انہی پرانے تختوں کو جوڑا، ان کے رخنوں کو بھرا اور پھٹے ہوئے بادبانوں کو رفو کرکے جیسے تیسے بن پڑا اسے ابھرنے کے قابل بنا لیا۔ دوسرے گروہ نے لپک کر ایک نیا (دخانی) جہاز کرایہ پر لے لیا اور ڈوبنے والوں کی ایک اچھی خاصی تعداد کو اس پر سوار کرا دیا

اس طریقہ سے دونوں گروہ اس اچانک مصیبت کو ٹالنے میں کامیاب ہوگئے۔ مگر یہ دونوں تدبیریں صرف اس حیثیت سے کامیاب تھیں کہ انہوں نے فوری ضرورت کے لحاظ سے چارہ سازی کردی اور ڈوبتوں کو ہلاکت سے بچا لیا۔ ان میں حکمت اور دانشمندی جو کچھ بھی تھی، صرف اسی حد تک تھی۔ اب جو لوگ اس وقت کے ٹل جانے کے بعد بھی انہی دونوں تدبیروں کو ٹھیک ٹھیک انہی دونوں شکلوں پر باقی رکھنا چاہتے ہیں ان کا طرزِ عمل حکمت و دانش کے خلاف ہے۔ نہ تو پرانا بادبانی جہاز اس قابل ہے کہ مسلمان صرف اسی پر بیٹھ کر ان قوموں سے مطابقت کرسکیں جن کے پاس اس سے ہزار گنی زیادہ تیز رفتار سے چلنے والے کلدار جہاز ہیں، نہ کرایہ پر لیا ہوا دخانی جہاز اس لائق ہے کہ مسلمان اس کے ذریعہ سے اپنی منزلِ مقصود کو پہنچ سکیں، کیونکہ اس کا ساز و سامان تو ضرور نیا ہے اور اس کی رفتار بھی تیز ہے اور وہ کلدار بھی ہے، مگر وہ دوسروں کا جہاز ہے، اس کا ڈزاین انہی کے مقاصد اور انہی کی ضروریات کے لیے موزوں ہے، اور اس کے رہنما اور ناخدا بھی وہی ہیں، لہٰذا اس جہاز سے ہم کبھی یہ امید نہیں کرسکتے کہ وہ ہمیں اپنی منزلِ مقصود کی طرف لے جائے گا، بلکہ اس کی تیز رفتاری سے الٹا خطرہ یہ ہے کہ وہ ہمیں زیادہ سرعت کے ساتھ مخالف سمت پر لے جائے گا، اور روز بروز ہمیں اپنی منزلِ مقصود سے دور کرتا چلا جائے گا۔ فوری ضرورت کے وقت تو وہ لوگ بھی حق بجانب تھے جنہوں نے پرانے جہاز کی مرمت کی، اور وہ بھی غلطی پر نہ تھے جنہوں نے کرایہ کے جہاز پر سوار ہوکر جان بچائی۔ مگر اب وہ بھی غلطی پر ہیں جو پرانے جہاز میں ڈٹے بیٹھے ہیں، اور وہ بھی غلطی پر ہیں جو اسی کرایہ کے جہاز پر جمے ہوئے ہیں۔

اصلی رہنما اور حقیقی مصلح کی تعریف یہ ہے کہ وہ اجتہادِ فکر سے کام لیتا ہے اور

وقت اور موقع کے لحاظ سے جو مناسب ترین تدبیر ہوتی ہے اسے اختیار کرتا ہے۔ اس کے بعد جو لوگ اس کا اتباع کرتے ہیں وہ اندھے مقلد ہوتے ہیں۔ جس طریقہ کو اس نے وقت کے لحاظ سے اختیار کیا تھا، اسی طریقہ پر یہ اس وقت کے گذر جانے کے بعد بھی آنکھیں بند کرکے چلے جاتے ہیں، اور اتنا نہیں سوچتے کہ ماضی میں جو انسب تھا حال میں وہی غیر انسب ہے۔ پچھلی صدی کے رہنماؤں کے بعد اُن کے متبعین آج بھی اسی روش پر اصرار کر رہے ہیں جس پر ان کے رہنما انہیں چھوڑ گئے تھے، حالانکہ وہ وقت جس کے لیے انہوں نے وہ روش اختیار کی تھی، گذر چکا ہے۔ اب اجتہاد فکر سے کام لے کر نیا طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

بدقسمتی سے ہم کو دونوں گروہوں میں ایک بھی مجتہد نظر نہیں آتا۔ انتہائی جرأت کرکے پُرانے جہاز والوں میں سے کوئی اگر اجتہاد کرتا ہے تو بس اتنا کہ اپنے اسی پرانے جہاز میں چند بجلی کے بلب لگا لیتا ہے، کچھ نئے طرز کا فرنیچر مہیا کر لیتا ہے، اور ایک چھوٹی سی دخانی کل خرید لاتا ہے جس کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ دور سے سیٹی بجا بجا کر لوگوں کو یہ دھوکہ دیتی رہے کہ یہ پرانا جہاز اب نیا ہو گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں نئے جہاز والے اگرچہ دوسروں کے جہاز پر بیٹھے ہیں اور تیزی کے ساتھ سمت مخالف پر بہے چلے جا رہے ہیں، مگر دو چار پرانے بادبان بھی لیکر بیسویں صدی کے اس اپ ٹو ڈیٹ جہاز میں لگائے ہوئے ہیں، تاکہ خود اپنے نفس کو اور مسلمانوں کو یہ دھوکہ دے سکیں کہ یہ جہاز بھی "اسلامی جہاز" ہے اور لندن کے راستہ سے حج کعبہ کو چلا جا رہا ہے۔

اندھی تقلید اور اس کے ساتھ اجتہاد کی جھوٹی نمائش تا کجے۔ ایک طوفان گذر گیا اب دوسرا طوفان بہت قریب ہے۔ ہندوستان میں ایک دوسرے سیاسی انقلاب کی بنا

پڑ رہی ہے۔ ممالکِ عالم میں ایک اور بڑے انقلاب کے سامان ہو رہے ہیں جو بہت ممکن ہے کہ ہندوستان میں متوقع انقلاب کے بجائے ایک بالکل غیر متوقع اور ہزار درجہ زیادہ خطرناک انقلاب برپا کردیں یہ آنے والے انقلابات ۵۷ء کے ہنگامے کی بہ نسبت اپنی نوعیت اور اپنی شدت کے لحاظ سے بالکل مختلف ہوں گے۔ اس وقت مسلمانوں کی اعتقادی و ایمانی اور اخلاقی و عملی حالت جیسی کچھ ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم نہیں سمجھتے کہ وہ ان آنے والے طوفانوں کی ایک ٹکر بھی خیریت کے ساتھ سہ سکیں گے۔ ان کا پرانا جہاز دورِ جدید کے کسی ہولناک طوفان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ شاید ایک ہی تھپیڑے میں اس کے تختے بکھر جائیں، اور اس کے بادبانوں کا تار تار الگ ہو جائے۔ رہا انکا کرایہ کا جہاز تو وہ پرانے جہاز سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ جو لوگ اس پر سوار ہیں، ہمیں خوف ہے کہ طوفانی دور کا پہلا ہی تھپیڑا ان کو ملتِ اسلامیہ سے جدا کرکے شاید ہمیشہ کے لیے ضلالت کے قعرِ عمیق میں لے جائیگا، لاقدر اللہ۔ پس اب یہی وقت ہے کہ مسلمان پرانے جہاز سے بھی نکلیں اور کرایہ کے جہاز سے بھی اتریں، اور خود اپنا ایک جہاز بنائیں جس کے آلات اور کل پرزے جدید ترین ہوں، مشین موجودہ دور کے تیز سے تیز جہاز کے برابر ہو، مگر نقشہ ٹھیٹھ "اسلامی جہاز" کا ہو، اور اس کے انجنیر اور کپتان اور دیدبان سب وہ ہوں جو منزلِ کعبہ کی راہ و رسم سے باخبر ہوں۔

استعارہ کی زبان چھوڑ کر اب ہم کچھ صاف صاف کہیں گے۔ سرسید احمد خاں مرحوم ومغفور کی قیادت میں علیگڈھ سے جو تعلیمی تحریک اٹھی تھی اس کا وقتی مقصد یہ تھا کہ مسلمان اس نئے دور کی ضروریات کے لحاظ سے اپنی دنیا درست کرنے کے قابل ہو جائیں، تعلیم جدید سے بہرہ مند ہو کر اپنی معاشی اور سیاسی حیثیت کو تباہی سے بچالیں، اور ملک کے جدید نظم ونسق سے استفادہ کرنے میں دوسری قوموں سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ اس وقت اس سے زیادہ کچھ کرنے کا موقع نہ تھا۔ اگرچہ اس تحریک میں فوائد کے ساتھ نقصانات اور خطرات بھی تھے، مگر اس

اتنی مہلت نہ تھی کہ غور و تفکر کے بعد کوئی ایسی محکم تعلیمی پالیسی متعین کی جاتی جو نقصانات سے پاک اور فوائد سے لبریز ہوتی۔ نہ اس وقت ایسے اسباب موجود تھے کہ اس نوع کی تعلیمی پالیسی کے مطابق عمل درآمد کیا جاسکتا۔ لہٰذا محض وقتی ضرورت کو پیش نظر رکھکر مسلمانوں کو اسی طرز تعلیم کی طرف دھکیل دیا گیا جو ملک میں رائج ہو چکا تھا، اور خطرات سے بچنے کے لیے کچھ تھوڑا سا عنصر اسلامی تعلیم و تربیت کا بھی رکھ دیا گیا جس کو جدید تعلیم اور جدید تربیت کے ساتھ قطعاً کوئی مناسبت نہ تھی

یہ صرف ایک وقتی تدبیر تھی جو ایک آفت ناگہانی کا مقابلہ کرنے کے لیے فوری طریق پر اختیار کر لی گئی تھی۔ اب وہ وقت گذر چکا ہے جس میں فوری تدبیر کی ضرورت تھی، وہ فائدہ بھی حاصل ہو چکا ہے جو اس تدبیر سے حاصل کرنا مقصود تھا، اور وہ خطرات بھی واقعہ کی صورت میں نمایاں ہو چکے ہیں جو اُس وقت صرف موہوم تھے۔ اس تحریک نے ایک حد تک ہماری دنیا تو ضرور بنا دی مگر جتنی دنیا بنائی اس سے زیادہ ہمارے دین کو بگاڑ دیا۔ اس نے ہم میں "کالے فرنگی" پیدا کئے، اس نے ہم میں "انگلو محمڈن" اور "انگلو انڈین" پیدا کئے، اور وہ بھی ایسے جن کے نفسیات میں "محمڈن" اور "انڈین" کا تناسب بس برائے نام ہی ہے۔ اس نے ہماری قوم کے طبقۂ علیا اور طبقہ متوسط کو، جو دراصل قوم کے اعضائے رئیسہ ہیں، باطنی و ظاہری دونوں حیثیتوں سے یورپ کی مادی تہذیب کے ہاتھ فروخت کر دیا، صرف اتنے معاوضہ پر کہ چند عہدے، چند خطاب اور چند کرسیاں ایسے لوگوں کو مل جائیں جن کے نام مسلمانوں سے ملتے جلتے ہوں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اب دائماً ہماری یہی تعلیمی پالیسی رہنی چاہیے؟ فی الواقع اگر یہی ہماری دائمی پالیسی ہے تو اس کے لیے علی گڑھ کی کوئی ضرورت اب باقی نہیں رہی۔ ہندوستان کے ہر بڑے مقام پر ایک "علیگڈھ" موجود ہے جہاں سے دھڑا دھڑ "انگلو محمڈن" اور "انگلو انڈین" نکل رہے ہیں۔ پھر یہ بس بھری فصل کاٹنے کے لیے ہم کو اپنا ایک مستقل مزرعہ رکھنے کی حاجت ہی کیا ہے؟ اور اگر در حقیقت اس حالت کو بدلنا مقصود ہے، تو ذرا ایک حکیم کی نظر سے دیکھئے کہ خرابی کے اصل اسباب کیا ہیں اور اسکو

دور کرنے کی صحیح صورت کیا ہے۔

جدید تعلیم و تہذیب کے مزاج اور اس کی طبیعت پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اسلام کے مزاج اور اسکی طبیعت کے بالکل منافی ہے۔ اگر ہم اس کو بجنسہ لیکر اپنی نوخیز نسلوں میں پھیلائیں گے تو ان کو ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے کھو دینگے۔ آپ انکو وہ فلسفہ پڑھاتے ہیں جو کائنات کے مسئلے کو خدا کے بغیر حل کرنا چاہتا ہے آپ انکو وہ سائنس پڑھاتے ہیں جو معقولات سے منحرف اور محسوسات کا غلام ہے۔ آپ ان کو تاریخ، سیاسیات، معاشیات، قانون اور تمام علوم عمرانیہ کی وہ تعلیم دیتے ہیں جو اپنے اصول سے لیکر فروع تک اور نظریات سے لیکر عملیات تک اسلام کے نظریات اور اصول عمران سے یکسر مختلف ہے۔ آپ ان کی تربیت تمام تر ایسی تہذیب کے زیر اثر کرتے ہیں جو اپنی روح اور اپنے مقاصد اور اپنے مناہج کے اعتبار سے کلیتہً اسلامی تہذیب کی ضد واقع ہوی ہے۔ اس کے بعد کس بنا پر آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ ان کی نظر اسلامی نظر ہوگی؟ انکی سیرت اسلامی سیرت ہوگی؟ انکی زندگی اسلامی زندگی ہوگی؟ قدیم طرز پر قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم اس نئی تعلیم کے ساتھ بے جوڑ ہے۔ اس قسم کے عمل تعلیم سے کوئی خوشگوار نتیجہ حاصل نہ ہوگا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے فرنگی اسٹیمر میں پرانے بادبان محض نمائش کے لیے لگا دیے جائیں۔ مگر ان بادبانوں سے فرنگی اسٹیمر قیامت تک اسلامی اسٹیمر نہ بنیگا۔

اگر فی الواقع علیگڈھ یونیورسٹی کو مسلم یونیورسٹی بنانا ہے تو سب سے پہلے مغربی علوم و فنون کی تعلیم پر نظر ثانی کیجیے۔ ان علوم کو جوں کا توں لینا ہی درست نہیں ہے۔ طالب علموں کی لوح سادہ پر اس نوع کی تعلیم کا نقش اس طرح مرتسم ہوتا ہے کہ وہ ہر مغربی چیز پر ایمان لاتے چلے جاتے ہیں۔ تنقید کی صلاحیت ان میں پیدا ہی نہیں ہوتی۔ اور اگر پیدا بھی ہوتی ہے تو فی ہزار ایک طالب علم میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد سالہا سال کے گہرے مطالعہ سے جبکہ وہ زندگی کے آخری مرحلوں میں پہنچ جاتا ہے اور کسی عملی کام کے قابل نہیں رہتا۔ اس طرز تعلیم کو بدلنا چاہیے۔ تمام مغربی علوم کو طلبہ کے سامنے تنقید کے ساتھ پیش کیجیے، اور یہ تنقید خالص اسلامی نظر سے ہو تاکہ وہ ہر قدم پر ان کے ناقص اجزاء کو چھوڑتے جائیں، اور صرف کارآمد حصوں کو لیتے چلے جائیں۔

اس کے ساتھ علوم اسلامیہ کو بھی قدیم کتابوں سے جوں کا توں نہ لیجیے بلکہ ان میں سے بھی متاخرین کی آمیزشوں کو الگ کر کے اسلام کے دائمی اصول اور حقیقی اعتقادات، اور غیر متبدل قوانین لیجیے، ان کی اصلی اسپرٹ دلوں میں اتاریئے اور ان کا صحیح تدبّر دماغوں میں پیدا کیجیے۔ اس غرض کے لیے آپ کو بنا بنایا نصاب کتب نہیں ملیگا ہر چیز از سر نو بنانی ہوگی۔ قرآن اور سنتِ رسول کی تعلیم سب پر مقدم ہے، مگر تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں سے نہیں! انکے پڑھانے والے ایسے ہونے چاہییں جو قرآن اور سنت کے مغز کو پا چکے ہیں۔ اسلامی قانون کی تعلیم بھی ضروری ہے، مگر یہاں بھی پرانی کتابیں کام نہ دیں گی۔ آپ کو معاشیات کی تعلیم میں اسلامی نظم معیشت کے اصول، قانون کی تعلیم میں اسلامی قانون کے مبادی، فلسفہ کی تعلیم میں حکمتِ اسلامیہ کے نظریات تاریخ کی تعلیم میں اسلامی فلسفہ تاریخ کے حقائق اور اسی طرح ہر علم و فن کی تعلیم میں اسلامی عنصر کو ایک غالب اور حکمران عنصر کی حیثیت سے داخل کرنا ہوگا۔

آپ کے تعلیمی اسٹاف میں جو ملاحدہ اور متفرنجین بھر گئے ہیں انکو رخصت کیجیے۔ خوش قسمتی سے ہندوستان میں ایک جماعت ایسے لوگوں کی پیدا ہو چکی ہے جو علوم جدیدہ میں بصیرت رکھنے کے ساتھ دل و دماغ اور نظر و فکر کے اعتبار سے پورے مسلمان ہیں۔ ان بکھرے ہوئے جواہر کو جمع کیجیے تاکہ وہ جدید آلات سے اسلامی نقشہ پر ایک اسٹیم بنائیں۔

آپ کہیں گے انگریز ایسی تعمیر کی اجازت نہ دیگا، یہ ایک حد تک صحیح ہے مگر آپ اس سے پوچھیے کہ تو پورے مسلمان اور پورے کمیونسٹ میں سے کس کو زیادہ پسند کرتا ہے؟ ان دونوں میں سے ایک کو بہرحال تجھے قبول کرنا ہوگا۔ سنہ ۱۹ء کا "اینگلو محمڈن" مسلمان اب زیادہ مدت تک نہیں پایا جا سکتا۔ اب اگر تو مسلمانوں کی نئی نسلوں کو پورا کمیونسٹ دیکھنا چاہتا ہے تو اپنی قدیم اسلام دشمنی پر جما رہ، نتیجہ خود تیرے سامنے آجائیگا اور اگر یہ منظور نہیں تو نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ تمام ہندوستان میں کمیونزم کی بڑھتی ہوی وبا کا مقابلہ صحیح النسب سانڈوں اور ریڈیو کے دیہاتی پروگرام سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس وبا کو صرف ایک طاقت روک سکتی ہے اور وہ اسلام کی طاقت ہے۔

مقالات

بشارات الانبیاءُ

نبوت محمدی صلعم کے متعلق انبیاء سابقین کی پیشنگوئیاں

(۵)

از جناب مولوی فضل حق صاحب

دسویں بشارت

کتاب یسعیاہ باب ۶۵ میں لکھا ہے :-

" میں نے ان کی طرف توجہ کی جنہوں نے مجھ سے نہ مانگا۔ انھوں نے مجھے پایا جنہوں نے مجھے نہ ڈھونڈا۔ میں نے ایک گروہ کو جو میرے نام کا نہ کہلاتا تھا کہا مجھے دیکھ مجھے دیکھ۔ میں اب تک[1] اپنے ہاتھ ایک ایسے سرکش گروہ کی طرف پھیلائے رہا جو خود اپنی اھوار کے اتباع[2] میں ایسے راستے پر چلتا ہے جو اچھا نہیں ہے ایسا گروہ جو ہمیشہ

[1] اردو ترجمہ میں "ہمیشہ اپنے ہاتھوں کو پھیلایا کیا" لکھا ہے مگر عربی ترجمہ کے الفاظ یہ ہیں بسطت یدیّ طول النہار - اور انگریزی ترجمہ کے الفاظ یہ ہیں :-

I have spread out my hands all the day unto a rebellious people

سیاق عبارت اور ان تراجم کو دیکھنے سے یہ مفہوم واضح ہو جاتا ہے کہ اب تک میں ایک ایسی نالائق قوم کی طرف ہاتھ پھیلائے رہا مگر اب میں اس سے ہاتھ کھینچ کر ایک دوسری قوم کی طرف توجہ کرونگا۔

[2] اردو ترجمہ کے الفاظ یہ تھے: "جو اپنی فکروں کی پیروی میں ایسی راہ چلتا ہے"۔ اس سے اصل مفہوم ظاہر نہیں ہوتا۔

میرے منہ پر مجھے غصہ دلاتا تھا[1] باغوں میں قربانیاں کرتا تھا اور اینٹوں پر بخور جلاتا تھا۔ جو قبروں میں رہتا مقابر[2] میں راتیں کاٹتا اور سوروں کے گوشت کھاتا تھا اور نجس چیزوں کا شوربا ان کے برتنوں میں رہتا تھا۔ جو کہتا تھا ادھر ہی کھڑا رہ میرے نزدیک مت آ کیونکہ میں تجھ سے زیادہ پاک ہوں۔ یہ میرے لیے ایسے ہیں جیسے میری ناک میں دھواں اور دن بھر سلگتی ہوئی آگ۔ دیکھو یہ میرے آگے لکھا ہوا فیصلہ رکھا[3] ہے۔ میں چپ نہ رہوں گا، بلکہ خود ان کی اپنی گودی میں بدلہ دونگا۔" (آیت ۶)

اس پیشین گوئی کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ یسعیاہ نبی کی زبان سے اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرمارہا ہے کہ اب تک میری تمام عنایات بنی اسرائیل کی طرف مبذول رہیں۔ مگر انھوں نے سرکشی اختیار کی اور میرے پسند کیے ہوئے طریقہ کو چھوڑ کر، اپنی خواہشات نفس اور غلط افکار کی پیروی میں ایسے راستوں پر چلنا شروع کر دیا جو مجھے پسند نہیں ہیں۔ وہ غیراللہ کے لیے نذر و نیاز اور قربانیاں کرنے لگے۔ اینٹ پتھر کی یادگاروں پر خوشبوئیں جلانے لگے۔ اپنے بزرگوں کے آثار اور مقابر کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ میری عبادت ہی چھوڑ دی اور وہ ہیں

[1] یہاں بھی ہم نے ترجمہ میں اصلاح کی ہے۔ بائبل کے اردو مترجم نے لکھا تھا: "میرے منہ پر مجھے کھجا کے غصہ دلاتی تھی" اس سے صحیح مفہوم ظاہر نہیں ہوتا۔ مطلب دراصل یہ ہے کہ یہ قوم میرے سامنے ایسی اور ایسی حرکات کرکے مجھے غصہ دلارہی تھی۔ [2] عربی ترجمہ میں "مدافن" اور انگریزی ترجمہ میں (**Monuments**) لکھا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ان لوگوں نے خدا کی عبادت چھوڑ کر قبر پرستی شروع کر دی تھی اور اپنے بزرگوں کے آثار سے انکا شغف اتنا بڑھ گیا تھا کہ مساجد اللہ سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔

[3] اردو کے مترجم نے اس فقرہ کا ترجمہ "میرے آگے یہ قلم بند ہوا ہے" کیا ہے۔ عربی کے مترجم نے قد کتب امامی لکھا ہے۔ آسمانی کتابوں میں خدا کے لکھے سے مراد خدا کا فیصلہ ہوتا ہے۔

ان کے جھمگٹے لگنے شروع ہو گئے۔ حرام و حلال کی تمیز ان سے جاتی رہی جن چیزوں کو میں نے حرام کیا تھا ان کو انہوں نے حلال کر لیا۔ اب میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ اس قوم سے انتقام لونگا اور اس سے نظر پھیر کر ایک ایسی قوم کی طرف توجہ کرونگا جو مجھکو نہیں جانتی۔ ان کو بے مانگے بہت ہدا ملے گی، وہ بے طلب مجھ کو پائیں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ دوسری قوم کونسی ہے؟ کیا یہ یونانی ہیں؟ مگر ان کی صنم پرستی تو مشہور ہے ان کے حق میں یہ بات کیسے صادق آسکتی ہے کہ انہوں نے خدا کو پایا؟ پھر کیا یہ رومی ہیں؟ مگر وہ بھی صنم پرست تھے۔ صدیوں تک صنم پرست رہے۔ بعد میں حضرت عیسیٰ پر ایمان بھی لائے تو اس طرح کہ پچھلے بتوں کو چھوڑ کر مریم اور مسیح اور صلیب کی پرستش شروع کر دی۔ بہر حال خدا کو انھوں نے بھی نہ پایا۔ اب سوائے اہل عرب کے اور کونسی قوم ایسی ہے جو خدا سے قطعاً جاہل تھی، جس نے خدا کو کبھی نہ ڈھونڈا تھا، اور خدا نے یک بیک اپنا رسول بھیج کر انہیں اپنے علم اور اپنی معرفت سے سرفراز کیا۔

گیارہویں بشارت

جس زمانہ میں بنی اسرائیل بابل کی قید میں تھے، بخت نصر نے ایک خواب دیکھا جس کی تعبیر دینے سے بابل کے تمام حکیم اور کاہن عاجز رہے۔ اس موقع پر بنی اسرائیل میں سے دانیال نبی نے بادشاہ کے پاس جا کر کہا کہ میں خدا کی وحی سے تیرے خواب کی تفصیل بھی بتاونگا جسے تو بھول گیا ہے۔ اور اس کی تعبیر بھی بیان کرونگا۔ یہ خواب اور اس کی تعبیر کتاب دانیال کے دوسرے باب میں اس طرح مذکور ہے۔

"تو نے اے بادشاہ نظر کی اور ایک بڑی مورت دیکھی۔ وہ بڑی مورت جس کی

"رونق بے نہایت تھی تیرے سامنے کھڑی ہوئی اور اس کی صورت ہیبت ناک تھی۔ اس مورت کا سر خالص سونے کا تھا۔ اس کا سینہ اور اس کے بازو چاندی کے، اس کا شکم اور رانیں تانبے کی، اس کی ٹانگیں لوہے کی اور اس کے پاؤں کچھ لوہے کے اور کچھ مٹی کے تھے۔ اور تو اسے دیکھتا رہا یہاں تک کہ ایک پتھر بغیر اس کے کہ کوئی ہاتھ سے کاٹ کے نکالے آپ سے آپ نکلا اور اس شکل کے پاؤں پر جو لوہے اور مٹی کے تھے لگا اور انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تب لوہا اور مٹی اور تانبا اور چاندی اور سونا ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے اور تابستانی کھلیان کی بھوسی کے مانند ہوئے اور ہوا انھیں اڑا لے گئی یہاں تک کہ ان کا پتہ نہ ملا اور وہ پتھر جس نے اس مورت کو مارا ایک بڑا پہاڑ بن گیا اور تمام زمین کو بھر دیا۔"

"وہ خواب یہ ہے اور اس کی تعبیر بادشاہ کے حضور بیان کرتا ہوں۔ تو اے بادشاہ، بادشاہوں کا بادشاہ ہے اس لیے کہ آسمان کے خدا نے تجھے ایک بادشاہت اور توانائی اور قوت اور شوکت بخشی ہے۔ اور جہاں کہیں بنی آدم سکونت کرتے ہیں اس نے میدان کے چوپائے اور ہوا کے پرندے تیرے قابو میں کر دیے اور تجھے ان سبھوں کا حاکم کیا۔ تو ہی وہ سونے کا سر ہے اور تیرے بعد ایک اور سلطنت برپا ہوگی جو تجھ سے چھوٹی ہوگی۔ اور اس کے بعد ایک اور سلطنت تانبے کی جو تمام زمین پر حکومت کرے گی اور چوتھی سلطنت لوہے کی مانند مضبوط ہوگی اور جس طرح کہ لوہا توڑ ڈالتا ہے اور سب چیزوں پر غالب ہوتا ہے، ہاں لوہے کی طرح سے جو سب چیزوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے اس طرح وہ ٹکڑے ٹکڑے کرے گی اور کچل ڈالے گی۔ اور جو کہ تو نے دیکھا کہ اس کے پاؤں اور انگلیاں کچھ تو کمہار کی مٹی اور کچھ لوہے

کی تھیں تو اس میں تفرقہ ہوگا، مگر جیسا کہ تو نے دیکھا کہ اس میں لوہا گارے سے ملا ہوا تھا، سو لوہے کی توانائی اس میں ہوگی۔ اور جیسا کہ پاؤں کی انگلیاں کچھ لوہے کی اور کچھ مٹی کی تھیں سو وہ سلطنت کچھ قوی کچھ ضعیف ہوگی۔ اور جیسا تو نے دیکھا کہ لوہا گارے سے ملا ہوا ہے، وے اپنے کو انسان کی نسل سے ملا دیں گے لیکن جیسے لوہا مٹی سے میل نہیں کھاتا ویسے ہی وے باہم میل نہ کھائیں گے۔ اور ان بادشاہوں کے ایام میں آسمان کا خدا ایک سلطنت برپا کرے گا جو تا ابد نیست نہ ہووے گی اور وہ سلطنت دوسری قوم کے قبضے میں نہ پڑے گی وہ ان سب مملکتوں کو ٹکڑے ٹکڑے اور نیست کرے گی اور وہی تا ابد قائم رہے گی جیسا کہ تو نے دیکھا کہ وہ پتھر بغیر اس کے کہ کوئی ہاتھ سے اس کو پہاڑ سے کاٹ نکالے آپ سے آپ نکلا اور اس نے لوہے اور تانبے اور مٹی اور چاندی اور سونے کو ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ خدا تعالیٰ نے بادشاہ کو وہ کچھ دکھایا جو آگے کو ہونے والا ہے اور یہ خواب یقینی ہے اور اس کی تعبیر بھی یقینی۔ (آیت ۳۱ - ۴۵)۔

اس پیشنگوئی کا تعلق ان ممالک سے ہے جو اس وقت کلدانیوں کے زیر اثر تھے۔ اس مملکت میں پہلا انقلاب خود دانیال نبی کے سامنے ہوا جس کا ذکر کتاب دانیال کے پانچویں باب میں ہے۔ یہ مادیوں کی حکومت تھی اور بخت نصر کی سلطنت سے ضعیف تر تھی۔ اس کو چاندی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد کیانیوں کی حکومت ہوئی جسے پیشنگوئی میں تانبے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد یونانی آئے جنہوں نے لوہے کی طرح ان تمام ممالک کو کچل ڈالا۔ پھر یہ سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی اور ساسانیوں کا دور آیا۔ ان کی سلطنت میں کچھ تو لوہے کی سی مضبوطی تھی اور کچھ مٹی کی سی کمزوری۔ ان کے دور میں طبقات اور نسلوں کے امتیازات تھے جن کی بنا پر دانیال نبی نے کہا ہے

کہ "وے اپنے کو انسان کی نسل سے ملائیں گے لیکن جیسا لوہا مٹی سے میل نہیں کھاتا ویسے ہی وے باہم میل نہ کھائیں گے"۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان میں حکمران طبقہ (لوہا)، اہل زمین (مٹی) سے ہمیشہ جدا رہے گا، اور ان کے درمیان کوئی میل نہ ہوگا جو انہیں ایک قوم بنا دے۔ آخر میں ایک پتھر ظاہر ہوا جس کو کسی نے کاٹ کر نہ نکالا تھا بلکہ وہ آپ سے آپ نکلا۔ مورت کے پاؤں، یعنی ساسانی سلطنت پر گرا اور سب لوہے اور مٹی اور تانبے اور چاندی اور سونے کو اس نے پاش پاش کر ڈالا۔ پھر یہی پتھر اس تمام مملکت پر چھا گیا اور ساری زمین کو اس نے بھر دیا۔ دانیال نبی اس پتھر کی تعبیر یہ دیتے ہیں کہ وہ ایک سلطنت ہوگی جس کو خدا برپا کرے گا اور وہ تا ابد نیست و نابود نہ ہوگی اور دوسری قوم کے قبضے میں نہ پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد اسلامی سلطنت ہے جو ساڑھے تیرہ سو برس سے ان ممالک پر قابض ہے۔ قوموں پر قومیں آئیں اور اسلامی قومیت میں جذب ہو کر اسی پتھر کا ایک ایک جز بنتی چلی گئیں جو ابتدا میں عرب کی جانب سے آیا تھا۔ اس طرح اس پتھر کی وحدت بدستور قائم رہی اور سینکڑوں انقلابات کے باوجود وہ جوں کا توں رہا۔ بلکہ اور زیادہ پھیلتا چلا گیا۔

بارھویں بشارت

کتاب ملاکی باب سوم کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے:۔

"دیکھو میں اپنے رسول کو بھیجوں گا اور وہ میرے آگے میری راہ کو درست کرے گا اور وہ خداوند جس کی تلاش میں تم ہو، ہاں عہد کا رسول جس سے تم خوش ہو وہ اپنی ہیکل میں ناگہاں آوے گا دیکھو وہ یقیناً آوے گا رب الافواج فرماتا ہے"۔

اس پیشنگوئی میں جس کو "عہد کا رسول" کہا گیا ہے اس کے لیے بائبل کے قدیم نسخوں

میں "ختنہ کا رسول" لکھا ہوا تھا۔ بعد میں ترمیم کی گئی اور "عہد کا رسول" لکھ دیا گیا لیکن اس سے بھی حقیقت نہ بدلی۔ کیونکہ عہد سے مراد وہی ختنہ کا عہد ہے[۱] جو ابراہیم علیہ السلام اور ان کی نسل سے لیا گیا تھا۔ کتاب پیدائش باب ۱۷ میں اس کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ پایا جاتا ہے :-

"پھر خدا نے ابرہام سے کہا کہ تو اور تیرے بعد تیری نسل پشت در پشت میرے عہد کو نگاہ رکھیں۔ اور میرا عہد جو میرے اور تمہارے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے جسے تم یاد رکھو سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جاوے؛ اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کیا کرو اور یہ اس کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے (آیت ۹ - ۱۱)۔

اس تشریح کو پیش نظر رکھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مذکورۂ بالا پیشینگوئی میں رسول موعود کی امتیازی علامت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ ختنہ کی ابراہیمی سنت کو اپنی امت میں جاری کریگا۔ یہ علامت اہل کتاب میں مشہور تھی۔ چنانچہ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ قیصر روم (ہرقل) کو جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر پہنچی تو اس نے دریافت کیا کہ کیا اس قوم میں ختنہ کا رواج ہے؟ تحقیق سے اس کا جواب اثبات میں ملا۔ تب اسنے اپنے ایک دوست کو جو رومیہ قسطنطنیہ میں تھا اس واقعہ کی خبر دی اور یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ نبی جس کا انتظار تھا یہی ہے۔ وہاں سے بھی جواب آیا کہ قیاس درست ہے۔ اس کے بعد قیصر نے اپنے اعیان دولت کو جمع کر کے کہا کہ "اے اہل روم! اگر تم فلاح اور رشد کے طالب ہو اور چاہتے ہو

[۱] لفظ عہد کے معنی یہاں دور اور زمانہ کے نہیں ہیں بلکہ میثاق کے ہیں چنانچہ انگریزی ترجمہ میں Messenger of the Covenant ہے اور یہی لفظ Covenant کتاب پیدائش باب ۱۷ میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔

کہ تمہاری حکومت برقرار رہے تو اس نبی سے بیعت کرلو" (بخاری۔ باب کیف کان بدء الوحی)۔
اس قصے سے ثابت ہوتا ہے کہ کتاب ملاکی میں رسول عہد سے مراد رسول ختنہ ہی ہے۔ اور اس زمانہ کے اہل کتاب من جملہ دوسری علامات کے اس علامت سے بھی واقف تھے، اور جن لوگوں کو کتاب کا علم تھا، انہوں نے اسلام کی سنتِ اختتان کا حال معلوم کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان لیا تھا۔

یہاں یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ختنہ کی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امتیازی علامت ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو صرف ان کی نسل کے لیے ختنہ کا حکم دیا گیا تھا۔ چنانچہ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں میں ختنہ کا رواج محض ایک خاندانی رواج کی حیثیت سے تھا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سنت کو بلا لحاظ نسل ونسب تمام مسلمانوں میں رائج کیا۔ اسی وجہ سے بائیبل میں آپ کو "رسول ختنہ" کے الفاظ سے یاد کیا گیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہرقل نے جب شاہ غسان کے قاصد کی زبانی آپ کے مبعوث ہونے کی پہلی اطلاع پانے سے پہلے نجوم کے ذریعہ سے آپ کی بعثت کا حال معلوم کیا تو اپنے حاشیہ نشینوں سے کہا کہ "مَلِكُ الختان" (یعنی ختنہ کا بادشاہ) پیدا ہو چکا ہے۔ بخاری میں امام زہری نے ابن الناطور[1] کی جو روایت نقل کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "ملکُ الختان" کے ظہور کا حال جس روز ہرقل کو نجوم کے طریق سے معلوم ہوا اس روز وہ سخت پریشان اور بد حواس تھا۔ (اصبح خبیث النفس) یہ بات ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ محضُ ختنہ کے بادشاہ کا ظہور کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے کسی کو پریشانی لاحق ہو۔ دراصل جس چیز سے وہ پریشان ہوا وہ یہ تھی کہ

---

[1] ابن الناطور شام کے نصاریٰ کا اسقف اور بیت المقدس کا حاکم اور ہرقل کا خاص دوست تھا بعد میں مسلمان ہوا اور یہ روایت بیان کی۔

بائبل میں وہ رسول ختنہ کا حال پڑھ چکا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اس رسول کے مقابلہ میں کوئی قوت نہ ٹھیر سکے گی اور تمام سلطنتیں زیر وزبر ہو جائینگی۔ چنانچہ جب شاہ غسان کے قاصد سے اس کو بعثت محمدی کی خبر ملی تو سب سے پہلے اس نے یہی دریافت کیا کہ کیا اس قوم میں ختنہ کا رواج ہے، اور جب اس کی تصدیق ہوی تو اپنی قوم کو مسلمان ہو جانے کا مشورہ دیا۔ پھر مزید تحقیق کے لیے حجاز کے ان تاجروں کو اپنے پاس طلب کیا جو ابوسفیان کی امارت میں اس وقت ایلیا (بیت المقدس) گئے ہوئے تھے، اور ان کی زبان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مزید حالات معلوم کرنے کے بعد صاف کہدیا کہ "اگر یہ بات سچی ہے تو یہ شخص عنقریب اس مقام پر قابض ہو جائے گا۔ جہاں میں اس وقت بیٹھا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ پیغمبر ظاہر ہونے والا ہے، مگر یہ خبر نہ تھی کہ وہ تم میں سے ہوگا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میں اس تک جا سکتا ہوں تو میں ضرور اس سے ملنے کی کوشش کرتا، اور اگر میں اس کے پاس ہوتا تو اس کے پاؤں دھوتا"۔ خود رومی تاریخیں بھی اس پر گواہ ہیں کہ ہرقل ہمیشہ مسلمانوں کے مقابلہ میں بے دلی سے لڑا۔ اس کی ہمیشہ یہ عادت رہی تھی کہ جنگ میں وہ خود ہی فوجوں کی قیادت کیا کرتا تھا۔ مگر مسلمانوں کے مقابلہ میں ایک مرتبہ بھی وہ نہیں آیا۔ شکستوں پر شکستیں ہوتی رہیں اور وہ منہ چھپائے بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ ۶۴۱ء میں جب وہ مرا تو بیان کیا جاتا ہے کہ بہیم خوف اور پریشانی اور دل شکستگی نے اس کو موت کے منہ میں پہنچایا۔

لہ مولانا رحمۃ اللہ ہندی نے اظہار الحق میں بارہویں بشارت اُس عبارت کو قرار دیا ہے جو یہوداہ کے خط عام کی چودھویں آیت میں حنوک کی زبانی نقل کی گئی ہے۔ مگر ہمارے نزدیک ملاکی نبی کی یہ بشارت اس سے بہت زیادہ واضح تھی اس لیے ہم نے اس کو چھوڑ کر اسے بیان کیا ہے۔

تیرہویں بشارت

یہاں تک جو بشارتیں نقل کی گئی ہیں وہ بائیبل کے عہد عتیق سے منقول تھیں اب ہم عہد جدید کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

انجیل متی باب ۳ کی ابتدا ان آیات سے ہوتی ہے:۔

"ان دنوں میں یوحنا بپتسمہ دینے والا آیا اور یہودیہ کے بیابان میں یہ منادی کرنے لگا کہ توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آگئی ہے"۔

پھر اسی انجیل کے چوتھے باب میں ہے:۔

"جب یسوع نے سنا کہ یوحنا گرفتار ہوا تو گلیل کو چلا گیا...... اس وقت سے یسوع نے منادی کرنی اور یہ کہنا شروع کیا کہ توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آئی...... اور یسوع تمام گلیل میں پھرتا رہا اور ان کے عبادت خانوں میں تعلیم دیتا اور بادشاہت کی خوش خبری کی منادی کرتا" (آیت ۱۲-۱۷، ۲۳)

اس کے بعد متی کے باب ۶ میں مسیح علیہ السلام نے اپنے پیرووں کو جو دعا سکھائی ہے اس میں منجملہ اور باتوں کے ایک یہ بھی ہے کہ "تیری بادشاہت آئے" (آیت ۱۰)۔

پھر متی کے باب ۱۰ میں یہ ذکر ہے کہ مسیح علیہ السلام نے اپنے بارہ شاگردوں کو "اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں" کے پاس جانے کا حکم دیا اور ان کو بہت سی وصیتیں کیں جن میں پہلی وصیت یہ تھی کہ:۔

"اور چلتے ہوئے منادی کرو کہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آگئی ہے۔ (آیت ۷)۔

ایک دوسرے تبلیغی وفد کا ذکر انجیل لوقا کے دسویں باب میں اس طرح کیا گیا ہے :۔

"ان باتوں کے بعد خداوند نے ستر آدمی اور مقرر کئے اور جس جس شہر اور جگہ کو خود جانے والا تھا وہاں انھیں دو دو کر کے بھیجا۔ اور ان سے کہا کہ ..... وہاں کے بیماروں کو چنگا کرو اور ان سے کہو کہ خدا کی بادشاہت تمہارے نزدیک آگئی ہے۔ اور جس شہر میں تم داخل ہو اور وہاں کے لوگ تمہیں قبول نہ کریں تو باہر جاکر وہاں کی سڑکوں پر کہو کہ ہم اس گرد کو بھی جو تمہارے شہر سے ہمارے پاؤں میں لگی ہے تمہارے سامنے جھاڑے دیتے ہیں، مگر یہ جان لو کہ آسمان کی بادشاہت تمہارے نزدیک آپہنچی ہے۔" (آیت ۱۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱)۔

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت یحییٰ (یوحنا) حضرت عیسیٰ اور حوارین اور تلامذہ مسیح سب کے سب آسمان کی بادشاہت قریب آجانے ہی کی خبر دے رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ یہ بادشاہت آچکی ہے اور اس وقت موجود ہے پس اس تعلیم اور اس شریعت کو آسمان کی بادشاہت نہیں کہا جاسکتا جسے حضرت عیسیٰ نے پیش کیا، بلکہ حضرت عیسیٰ اس بادشاہت کے قریب آنے کی خبر دینے والے تھے، اور اپنے ۱۲ حواریوں اور ستر شاگردوں کو انہوں نے یہی دعا مانگنے کی ہدایت کی تھی کہ "تیری بادشاہت آئے"۔ نیز لفظ "بادشاہت" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ سلطنت کی صورت میں ہو نہ کہ مسکنت کی صورت میں۔ اور آسمان کی بادشاہت یا خدا کی بادشاہت کے معنی صاف یہ ہیں کہ سلطنت کا قانون خدا کی ہدایت پر مبنی ہو، اور اس میں اتنی قوت ہو کہ وہ زمین میں شریعت الٰہی کو نافذ کر دے۔ چنانچہ مسیح علیہ السلام نے اپنے پیروؤں کو جو دعا سکھائی تھی اس میں "تیری بادشاہت آئے" کی تفسیر بعد کے فقرے سے اس طرح کی ہے کہ "تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین

پر بھی ہو" (متی باب ۶۔ آیت ۱۰) ظاہر ہے کہ یہ بات نہ مسیح علیہ السلام کے عہد میں حاصل ہوئی نہ ان کے حواریوں اور شاگردوں کے عہد میں، لہذا یہ کسی طرح نہیں کہا جاسکتا کہ "آسمان کی بادشاہت" آنے سے مراد خود مسیح علیہ السلام اور ان کے دین کی آمد ہے۔

علماء مسیحیہ اس کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کے دو تین صدی بعد ملت مسیحیہ کی جو عام اشاعت ہوئی اور رومی سلطنت کے دین مسیحی قبول کرنے کی وجہ سے اس کو جو غلبہ نصیب ہوا یہ اسی کی طرف اشارہ تھا، اور اسی کی بشارت تھی لیکن تاریخ اس بیان کو جھٹلاتی ہے کیونکہ مسیحی سلطنتوں کا قانون ابتدا سے آج تک کسی زمانہ میں بھی آسمانی شریعت پر مبنی نہیں ہوا۔ سینٹ پال نے پہلے ہی شریعت اور ایمان کا رشتہ کاٹ دیا تھا، اور تمام قوموں کو یہی کہکر مسیحیت کی طرف دعوت دی تھی کہ تمہارے لیے شریعت نہیں، صرف ایمان ہے۔ پس خدا کی بادشاہت اس معنی میں کہ اُس کی مرضی جس طرح آسمان پر پوری ہوتی ہے اسی طرح زمین پر بھی ہو" امت مسیحیہ کے ہاتھوں سے کبھی قائم ہی نہیں ہوئی، پھر ان کی سلطنت کو اس بشارت کا مصداق کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔ علاوہ بریں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو غیر قوموں کو دعوت دینے کی اجازت ہی نہ دی تھی، بلکہ بالفاظ صریح اس سے منع کیا تھا پھر جو قومیں ان کی تعلیم کے خلاف تثلیث پر ایمان لائیں، اور جنہوں نے ان کی ہدایت کے خلاف آسمانی شریعت کو چھوڑ کر اپنے خود ساختہ قوانین کو نافذ کیا ان کی بادشاہت کو آسمانی بادشاہت قرار دینا آنجناب کا مقصود کیونکر ہوسکتا تھا۔

یہ تو خارجی قرائن تھے۔ اب خود حضرت عیسیٰ کے دوسرے اقوال پر غور کرو کہ جس آسمانی بادشاہت کی انہوں نے بشارت دی ہے اس سے ان کی مراد کیا تھی۔ متی باب ۱۳ میں وہ فرماتے ہیں:۔

"آسمان کی بادشاہت اُس آدمی کے مانند ہے جس نے اپنے کھیت میں اچھا بیج بویا"

"آسمان کی بادشاہت اس رائی کے دانے کے مانند ہے جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بویا"

"آسمان کی بادشاہت اس خمیر کے مانند ہے جسے کسی عورت نے لے کر تین پیمانے آٹے میں ملا دیا اور ہوتے ہوتے سب خمیر ہو گیا"

ان فقروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس بادشاہت سے مسیح علیہ السلام کی مراد بیج بونے والا ہے نہ کہ فصل کاٹنے والا، اور رائی کا دانہ ہے نہ کہ اس دانہ سے نکلا ہوا بڑا درخت، اور وہ تھوڑا سا خمیر ہے جو آٹے میں ملایا جاتا ہے نہ کہ وہ بہت سا آٹا جو اس خمیر کے اثر سے خمیر بن جاتا ہے۔ اس تشریح سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ مسیح علیہ السلام نے جس آسمانی بادشاہت کی خوشخبری دی تھی وہ دراصل ایک پیغام حق اور قانون عدل تھا جو ان کے بعد آکر ایمان و عمل صالح کا دانہ بونے والا تھا تاکہ اس سے ایک شجر عظیم پیدا ہو اور نوع انسانی کے آٹے میں تھوڑا سا خمیر ملا دینے والا تھا تاکہ بے حد و حساب آٹا خمیر بن جائے۔ ایسا پیغام اور ایسا قانون نہ تو حضرت یحییٰ لائے، نہ حضرت عیسیٰ، نہ ان کے حواری۔ یہ سب تو اس کی آمد کی خبریں دے رہے تھے اور دعائیں مانگ رہے تھے۔

چودھویں بشارت

انجیل متی باب ۱۳ میں ہے:-

"اس نے ایک اور تمثیل ان کے سامنے پیش کر کے کہا کہ آسمان کی بادشاہت اس رائی کے دانے کے مانند ہے جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بو دیا۔ وہ

سب بیجوں سے چھوٹا ہوتا ہے مگر جب بڑھ جاتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا ہوتا ہے کہ ہوا کے پرندے آکر اس کی ڈالیوں پر بسیرا کرتے ہیں" (۳۱ ۔ ۳۲)۔

یہ تشبیہ ٹھیک ٹھیک شریعت محمدی علی صاحبہا السلام پر راست آتی ہے۔ واقعی وہ ابتدا میں ایک رائی کا دانہ تھا۔ ایک ایسی قوم میں بو یا گیا جو نہایت حقیر، بے سروسامان، بے زور و زر، اور خصوصاً یہودیوں کی نگاہ میں ذلیل و خوار تھی۔ مگر چند ہی سال کے اندر اسی رائی کے دانے سے ایک ایسا عظیم الشان درخت پیدا ہوا جو شرق و غرب پر چھا گیا حتیٰ کہ جن لوگوں نے اس شریعت کا اتباع قبول نہ کیا، وہ "ھوا" کے پرندے بھی اس کی کسی نہ کسی شاخ کے سایے میں آ ہی گئے۔

پندرہویں بشارت

انجیل متی کے بیسویں باب کا آغاز ان آیات سے ہوتا ہے:۔

"کیونکہ آسمان کی بادشاہت اس صاحب خانہ کے مانند ہے جو سویرے نکلا تاکہ اپنے انگوری باغ میں مزدور لگا دے۔ اور اس نے مزدوروں کا ایک ایک دینار روزینہ مقرر کرکے انھیں اپنے باغ میں بھیج دیا۔ پھر پہر دن چڑھے کے قریب نکل کر اس نے اوروں کو بازار میں کھڑے دیکھا اور ان سے کہا کہ تم بھی باغ میں چلے جاؤ، جو واجب ہے تمہیں دوں گا، پس وہ چلے گئے۔ پھر اس نے دوپہر اور تیسرے پہر کے قریب نکل کر ویسا ہی کیا۔ اور کوئی ایک گھنٹہ دن رہے پھر نکل کر اوروں کو کھڑے پایا اور ان سے کہا تم کیوں یہاں تمام دن بیکار کھڑے رہے؟ انہوں نے اس سے کہا اس لیے کہ ہم کو کسی نے مزدوری پر نہیں لگایا۔

اس نے ان سے کہا تم بھی باغ میں چلے جاؤ۔ جب شام ہوئی تو باغ کے مالک نے اپنے کارندے سے کہا کہ مزدوروں کو بلا اور پچھلوں سے لے کر پہلوں تک انھیں مزدوری دے دے۔ جب وہ آئے جو گھنٹہ بھر دن رہے لگائے گئے تھے تو انھیں ایک ایک دینار ملا۔ جب پہلے مزدور آئے تو انہوں نے یہ سمجھا کہ ہمیں زیادہ ملے گا اور ان کو بھی ایک ہی ایک دینار ملا۔ جب ملا تو گھر کے مالک سے یہ کہکر شکایت کرنے لگے کہ ان پچھلوں نے ایک ہی گھنٹہ کام کیا ہے اور تو نے انہیں ہمارے برابر کر دیا جنہوں نے دن بھر کا بوجھ اٹھایا اور سخت دھوپ سہی۔ اس نے جواب دے کر ان میں سے ایک سے کہا کہ میاں میں تیرے ساتھ بے انصافی نہیں کرتا۔ کیا تیرا مجھ سے ایک دینار نہیں ٹھیرا تھا؟ جو تیرا ہے اٹھا لے اور چلا جا۔ میری مرضی یہ ہے کہ جتنا تجھے دیتا ہوں اس پچھلے کو بھی اتنا ہی دوں کیا مجھے روا نہیں کہ اپنے مال کو جو چاہوں سو کروں؟ یا تو اس لیے کہ میں نیک ہوں بری نظر سے دیکھتا ہے؟ اسی طرح آخر اول ہو جائیں گے اور اول آخر کیونکہ بہت سے بلائے جاتے ہیں اور منتخب تھوڑے ہی ہوتے ہیں" (آیت ۱-۱۶)۔

اس تمثیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے امتوں کا حال بیان کیا ہے کہ بار بار دعوت حق ان کے پاس آئی اور ان کو اجر آخرت کے عوض دنیوی زندگی کے عمل صالح میں لگاتی رہی۔ ان میں آخری امت وہ تھی جو دن بھر بیکار کھڑی رہی، اور دن ڈوبنے کے قریب یہ دعوت اس کے پاس پہنچی۔ یہی امت مسلمہ ہے۔ وقت کے اعتبار سے یہ آخری امت ہے۔ مگر اجر کے اعتبار سے یہ سب پر سبقت لے جائے گی۔ اسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ نحن الآخرون السابقون۔[1]

[1] صحیح بخاری میں ابن عمر کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری اور اہل کتاب

سولہویں بشارت

انجیل متی باب ۲۱ میں ہے:۔

"ایک اور تمثیل سنو۔ ایک گھر کا مالک تھا جس نے انگوری باغ لگایا۔ اور اس کے چاروں طرف احاطہ گھیرا اور اس میں حوض کھودا اور برج بنایا۔ اور اسے باغبانوں کو ٹھیکے پر دیکر پردیس چلا گیا۔ اور جب پھل کا موسم قریب آیا تو اپنے نوکروں کو باغبانوں کے پاس اپنا پھل لانے کے لیے بھیجا۔ مگر باغبانوں نے اس کے نوکروں کو پکڑ کر کسی کو پیٹا اور کسی کو قتل کیا اور کسی کو سنگسار کیا۔ پھر اس نے اور نوکروں کو بھیجا جو پہلوں سے زیادہ تھے۔ انہوں نے ان کے ساتھ بھی ویسا ہی کیا۔ آخر اس نے اپنے بیٹے کو ان کے پاس یہ کہکر بھیجا کہ وہ میرے بیٹے کا تو لحاظ کریں گے جب باغبانوں نے بیٹے کو دیکھا تو آپس میں کہا کہ یہی وارث ہے۔ آؤ اسے قتل کرکے اس کی میراث پر قبضہ کرلیں۔ اور پکڑ کر باغ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۔ کے پچھلے دونوں طبقوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے کچھ مزدور مقرر کیے اور کہا کہ جو شخص میرے لیے صبح سے دوپہر تک کام کرے گا اس کو ایک ایک قیراط ملے گا چنانچہ یہودیوں نے اس اجرت پر مزدوری کی پھر اس نے کہا کہ جو شخص دوپہر سے عصر کے وقت تک کام کریگا اس کو ایک ایک قیراط ملے گا۔ چنانچہ نصاریٰ نے بھی اس اجرت پر کام کیا۔ پھر اس نے کہا کہ جو شخص میرے لیے عصر سے غروب آفتاب تک کام کرے گا اس کو دو دو قیراط ملیں گے۔ چنانچہ تم وہی مزدور ہو۔ یہود و نصاریٰ اس پر ناراض ہوئے اور انہوں نے کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ ہم سے زیادہ دیر تک کام لیا گیا اور مزدوری کم دی گئی۔ مالک نے جواب دیا کیا میں نے تمہارے حق میں کچھ کم دیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں کم تو نہیں دیا۔ مالک نے کہا بس تو یہ میرا فضل ہے جس کو چاہوں دوں

سے باہر نکالا اور قتل کر دیا۔ پس جب باغ کا مالک آئے گا تو ان باغبانوں کے ساتھ کیا کرے گا؟ انہوں نے اس سے کہا کہ ان برے آدمیوں کو بری طرح ہلاک کرے گا اور باغ کا ٹھیکا اور باغبانوں کو دے گا جو موسم پر اس کو پھل دیں۔ یسوع نے ان سے کہا کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی۔ اور جو اس پتھر پر گرے گا چور چور ہو جائے گا۔ مگر جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔ اور جب سردار کاہنوں اور فریسیوں نے اس کی تمثیل سنی تو سمجھ گئے کہ ہمارے حق میں کہتا ہے" (آیت ۳۳ تا ۴۵)

یہ ایسا واضح بیان ہے کہ شاید ہی اس سے زیادہ واضح ہو سکے۔ باغ کے مالک سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ باغ یہی دنیا ہے۔ باغبان اہل دنیا ہیں۔ مالک کے پردیس جانے سے مراد اس کا نظروں سے پوشیدہ ہونا اور دنیا کے عمل کو اہل دنیا کے اختیار میں دینا ہے۔ اہل دنیا نے ان اختیاری اعمال میں ہمیشہ سرکشی کی اور عمل صالح کے پھل پیش نہ کیے۔ مالک نے بار بار انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کیا۔ مگر دنیا والوں نے کسی کو قتل کیا، کسی کو سنگسار کیا، اور کسی کو اذیتیں پہنچائیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو بھیجا۔ عیسائی خود حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ اس لیے بیٹے کو بھیجنے سے مراد انہی کی بعثت ہو سکتی ہے، اور اس کے سوا کوئی اور مراد نہیں لی جا سکتی۔ باغبانوں نے بیٹے کو قتل کر دیا۔ یہ واقعہ صلیب کی طرف کھلا اشارہ ہے۔ اور نصاریٰ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ ہی صلیب پر چڑھائے گئے تھے۔ اب اس کے بعد انجیل کی عبارت صاف کہہ رہی ہے کہ بیٹے کو قتل کرنے کی پاداش میں تم سے

خدا کی بادشاہت چھین لی جائیگی۔ جس پتھر کو معماروں نے رد کردیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہوگا۔ اور وہ ایسا پتھر ہوگا کہ جو قوت اس سے ٹکرائے گی پاش پاش ہو جائیگی۔ یہ نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور، اور قوم عرب (یعنے رد کیے ہوئے پتھر) کے عروج، اور اسلام کے مادی و روحانی غلبہ کی کھلی ہوئی بشارت ہے۔

مسیحی علماء کہتے ہیں کہ کونے کے پتھر سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں مگر یہ متعدد وجوہ سے غلط ہے۔

(۱) تمثیل میں کتاب مقدس کی جس عبارت کا حوالہ دیا گیا ہے وہ زبور ۱۱۸ میں اس طرح لکھی ہوئی ہے:۔

"وہ پتھر جسے معماروں نے رد کیا کونے کا سرا ہوگیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا۔ اور یہ ہماری نظروں میں عجیب ہے"۔ (آیت ۲۲۔ ۲۳)۔

اگر اس پتھر سے مراد حضرت عیسیٰ ہوتے تو پھر یہ کہنے کے کیا معنی ہیں کہ "یہ ہماری نظروں میں عجیب ہے"۔ حضرت عیسیٰ تو بنی اسرائیل میں سے ہیں۔ خود حضرت داؤد کی اولاد سے ہیں مسیحیوں کا اعتقاد یہ ہے کہ حضرت داؤد نے اپنے مزامیر میں ان کی تعریف کے گیت گائے ہیں اور ان کو خداوند کہا ہے۔ پھر اگر وہ کونے کا پتھر ہوجائیں تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ رد کیا ہوا پتھر تو بنی اسمٰعیل میں سے ہونا چاہیے کیونکہ انہی کو بنی اسرائیل اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ ان میں نبوت او رحکمت ہو، اور انہی کی سرفرازی قابل تعجب ہو سکتی ہے

(۲) اس پتھر کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ جو اس پر گرے گا وہ چور چور ہو جائے گا اور جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔ یہ وصف حضرت عیسیٰ پر صادق نہیں آتا۔ وہ تو خود کہتے ہیں کہ میں سزا دینے پر مامور نہیں ہوں (یوحنا ۱۲۔ آیت ۴۷)۔ اور تاریخ سے بھی یہی صادق

ہوتا ہے کہ مسیحیت کو مسیحیت ہونے کی حیثیت سے کبھی اتنی قوت حاصل نہیں ہوئی کہ جو اس سے ٹکرائے وہ چور چور ہو جائے۔ بخلاف اس کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ تعریف ٹھیک ٹھیک صادق آتی ہے اس لئے کہ اول روز سے آپ کا دین ایک غیر معمولی طاقت کے ساتھ اٹھا اور بڑی بڑی قومیں اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئیں۔

(۳) حضرت عیسیٰ کے کلام میں خود یہ بات واضح نظر آتی ہے کہ یہ پتھر بیٹے کے ماسوا ہے اور بیٹے کے قتل ہونے کے بعد لگایا جائیگا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میری مثال انبیاء میں ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی اور نہایت خوبی کے ساتھ اس کو تعمیر کیا مگر ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی۔ لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے تھے اور اس کے حسن کی تعریف کرتے تھے۔ مگر اس خالی جگہ کو دیکھ کر کہتے تھے کہ یہ کیوں چھوٹی ہوئی ہے؟ سو اب وہی جگہ بھر دی گئی ہے اور میں ہی وہ آخری اینٹ ہوں[1]۔ یہ بیان زبور اور انجیل کے مذکورہ بالا عبارتوں سے کس قدر ٹھیک ٹھیک مطابق ہوتا ہے۔

سترہویں بشارت

یوحنا عارف کے مکاشفہ میں لکھا ہے:۔

"اور وہ جو غالب آئے اور میرے کاموں کو آخر تک قائم رکھے میں اسے قوموں پر اختیار دونگا اور وہ لوہے کے عصا سے ان پر حکومت کرے گا۔ وہ کمہار کے برتنوں کی طرح چکنا چور ہوں گے۔ ایسا ہی میں نے اپنے باپ سے پایا ہے اور میں اسے صبح کا ستارہ دونگا جس کے کان ہوں وہ سنے کہ روح کلیساؤں سے کیا کہتی ہے (باب ۲۔ آیت ۲۶۔ ۲۹)۔

اس عبارت میں لوہے کا عصا دیا جانا، اور کمہار کے برتنوں کی طرح قوموں کو چکنا چور کرنا، اور مسیح کے حقیقی مشن کو تکمیل اور دوام بخشنا، یہ ایسی علامتیں ہیں جو محمد

[1] اس مضمون کی حدیثیں بخاری اور مسلم میں حضرت جابر اور حضرت ابوہریرہ سے مروی ہیں۔

صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور پر راست نہیں آتیں۔ اور صبح کے ستارے سے غالباً قرآن مجید کی طرف اشارہ ہے، کیوں کہ وہی کتب آسمانی میں آخری کتاب ہے اور اسی کی روشنی طلوع صبح محشر تک قائم رہے گی۔

صاحب صولۃ الضیغم[۱] نے اس بشارت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ جب پادری وٹ و اور ولیم سے میرا مناظرہ ہوا تو میں نے کہا کہ وہ لوہے کا عصا جس کا ذکر یوحنا کے مکاشفہ میں کیا گیا ہے، اس کے مالک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ یہ سن کر وہ ذرا پریشان ہوئے، پھر انہوں نے کہا کہ مسیح نے تو اس ارشاد میں تھواتیرہ کے کلیسا کو خطاب کیا ہے، لہذا اس شخص کا ظہور وہیں ہونا چاہیے، مگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو وہاں کبھی نہیں گئے۔ میں نے پوچھا وہ تھواتیرہ کا کلیسا کہاں تھا؟ انہوں نے اپنی کتابوں کی ورق گردانی کرنے کے بعد جواب دیا کہ وہ بلاد روم میں استانبول کے قریب تھا۔ میں نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب آپ کی وفات کے چند ہی برس بعد وہاں پہنچ گئے تھے۔ ان میں سے ابو ایوب انصاریؓ کی قبر اب تک وہاں موجود ہے پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو آخر کار اس پوری سرزمین پر قابض ہوئے اور صدیوں تک لوہے کے عصا ہی سے اقوام فرنگ کو کمہار کے برتنوں کی طرح چکنا چور کرتے رہے۔

(باقی)

---

[۱] یہ کتاب ۱۲۸۸ ہجری کے قریب زمانہ میں عباس علی جاجموی نے لکھی تھی۔ اور فاضل حنبل موصوف کا مناظرہ پادری ویٹ اور پادری ولیم سے کانپور میں ہوا تھا۔

فتنۂ تکفیر

مولانا شبلی و مولانا حمید الدین پر تکفیر کا فتویٰ اور اس پر ایک نظر

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنے جو احسانات گنائے ہیں، ان میں نعمت ہدایت کے بعد سب سے بڑی نعمت اس رابطۂ الفت و محبت کو قرار دیا ہے جو ایمان و اسلام کے رشتہ سے تمام مسلمانوں کے درمیان قائم کیا گیا ہے:۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (آل عمران)

اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط تھامے رہو اور پراگندہ نہ ہو اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو اس نے تم پر نازل کی کہ تم آپس میں دشمن تھے پھر اللہ نے تمہارے دلوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا پھر تم بھائی بھائی بن گئے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو حبل اللہ فرمایا ہے وہ یہی ایمان و اسلام کا رشتہ ہے مختلف النسل، مختلف اللون، مختلف اللسان اور مختلف الاوطان لوگوں کو، جن کے درمیان عداوت کے بیسیوں اسباب موجود تھے، اسی حبل اللہ نے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرکے ایک قوم بنایا ہے، اور اس قوم کی فلاح و بہبود ہی نہیں بلکہ اس کا عین بقا اس پر منحصر ہے کہ اس کے افراد کے درمیان محبت اور اخوت اور معاونت کا یہ رشتہ نہ صرف قائم بلکہ خوب مضبوط اور مستحکم رہے۔ دوسری قوموں کے افراد کو خون کے رشتے ایک دوسرے سے ملاتے ہیں، زبان کی وحدت، رنگ کی یکسانی، وطن کی موافقت ایک دوسرے سے جوڑ کر ایک قوم بناتی ہے لیکن اسلام میں قومیت کا رابطہ بجز رابطۂ دینی کے اور کوئی نہیں ہے۔ ادھر یہ رابطہ ٹوٹا اور ادھر تمام افراد اس طرح بکھر گئے جیسے تسبیح کا

ڈورا ٹوٹتے ہی تمام دانے بکھر جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اسلام میں رابطۂ دینی کی حفاظت کے لیے بڑی تاکید کی گئی ہے اور اس پر حملہ کرنے والے کو سخت مجرم ٹھیرایا گیا ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا (النساء - ۱۳) — جو شخص (اظہار اسلام کے لیے) تم کو سلام کرے اس کو نہ کہو کہ تو مومن نہیں ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

ایما رجل قال لاخیہ یا کافر فقد باء بھا احدھما (بخاری)۔ — جس نے اپنے مسلمان بھائی کو کافر کہا تو ضرور ہے کہ یہ قول ان دونوں میں سے ایک پر پڑے گا۔

لا یرمی رجل رجلا بالفسوق ولا یرمیہ بالکفر الا ارتدت علیہ ان لم یکن صاحبہ کذالک (بخاری)۔ — ایک شخص جب دوسرے شخص پر فاسق یا کافر ہونے کا الزام لگائے گا درانحالیکہ وہ شخص ایسا نہ ہو تو یہ قول خود کہنے والے پر پلٹ جائے گا۔

من دعا رجلا بالکفر او قال عدو اللہ ولیس کذالک الاحار علیہ (مسلم) — جس نے کسی کو کافر کہا یا اللہ کا دشمن کہا درانحالیکہ وہ ایسا نہیں ہے تو یہ قول خود قائل پر ہی پلٹ جائیگا۔

من لعن مومناً فھو کقتلہ و من قذف مومناً بکفر فھو کقتلہ (بخاری)۔ — جس نے کسی مومن پر لعنت کی اس نے گویا اسے قتل کیا اور جس نے کسی مومن پر کفر کی تہمت لگائی اس نے گویا اسے قتل کیا۔

ان احکام کا منشا یہ ہے کہ مومن کو کافر کہنے میں اتنی ہی احتیاط کرنی چاہیے جتنی کسی شخص کے قتل کا فتویٰ صادر کرنے میں کی جاتی ہے۔ بلکہ یہ معاملہ اس سے بھی زیادہ سخت ہے کسی کو قتل کرنے سے کفر میں مبتلا ہونے کا خوف تو نہیں ہے مگر مومن کو کافر کہنے میں یہ خوف بھی ہے کہ اگر فی الواقع وہ شخص کافر نہیں ہے اور اس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان موجود ہے، تو کفر کی تہمت خود اپنے

اوپر پلٹ آئے گی۔ پس جو شخص اللہ تعالیٰ کا خوف اپنے دل میں رکھتا ہو، اور جس کو اس کا کچھ بھی احساس ہو کہ کفر میں مبتلا ہو جانیکا خطرہ کتنا بڑا خطرہ ہے، وہ کبھی کسی مسلم کی تکفیر کی جرأت نہیں کر سکتا، تاوقتیکہ اسے خوب چھان بین کرنے کے بعد اس کے مبتلائے کفر ہو جانے کا پورا علم نہ ہو جائے۔ اس باب میں احتیاط کی حد یہ ہے کہ جس شخص کے طرزِ عمل سے صاف طور پر نفاق ظاہر ہو رہا ہو، جس کا حال صاف بتا رہا ہو کہ وہ دل سے مسلمان نہیں ہے، وہ بھی اگر کلمہ اسلام اپنی زبان سے پڑھ دے تو اسے کافر کہنا اور اس کے ساتھ کافر کا سا معاملہ کرنا جائز نہیں۔ ایک مرتبہ ایک سریہ میں ایک شخص نے مسلمانوں کو دیکھ کر کہا السلام علیکم لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ ایک مسلمان نے یہ گمان کر کے اسے قتل کر دیا کہ اس نے محض جان بچانے کی خاطر کلمہ پڑھا ہے۔ ظاہر حال کے لحاظ سے یہ گمان کرنے کی معقول وجہ بھی موجود تھی، کیونکہ جنگ کا موقع تھا، تلواریں کھنچی ہوئی تھیں۔ کچھ بعید نہ تھا کہ اس مقتول کے دل میں درحقیقت ایمان نہ ہو، اور اس نے کلمہ کو محض جان بچانے کے لیے ڈھال بنانا چاہا ہو۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو آپ غضبناک ہوئے اور سختی کے ساتھ اس مسلمان سے باز پرس کی۔ اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس نے تو محض ہماری تلوار سے بچنے کے لیے کلمہ پڑھ دیا تھا۔ آپ نے جواب میں فرمایا ھلا شققت عن قلبہ "کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا؟" مطلب یہ ہے کہ تمہارا کام دلوں کا ٹٹولنا نہیں ہے۔ یہ حقیقت تو خدا ہی جانتا ہے کہ کس کے دل میں ایمان ہے اور کس کے دل میں نہیں۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى۔ تم صرف ظاہر کو دیکھ سکتے ہو۔ اور ظاہر میں جب ایک شخص اسلام کا اظہار کرے تو تمہیں کوئی حق نہیں کہ تاویلات سے اس کو کافر ٹھیراؤ اور اس کے ساتھ کفار کا سا معاملہ کرو۔

رشتۂ دینی کے احترام کی اتنی سخت تاکید اور اس کو قطع کرنے پر ایسی سخت وعید اسلیے

ہے کہ جو شخص مسلمان کی تکفیر کرتا ہے وہ در اصل اللہ کی اُس رسّی پر قینچی چلاتا ہے جس کے ذریعہ سے مسلمانوں کو جوڑ کر ایک قوم بنایا گیا ہے۔ اگر اسی طرح سے بات بات پر یہ حبل اللہ کاٹی جانے لگے تو ساری امت مسلمہ منتشر ہو کر رہ جائے گی مسلمانوں کے درمیان محبت اور تعاون اور معاشرت اور ہمدردی کے تمام تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔ اور ایک مرتبہ پھر یہ قوم آتش عداوت کے اسی گڑھے پر کھڑی نظر آئے گی جس سے اللہ نے اس کو نکالا تھا۔ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۔

یہی وجہ ہے کہ متقی اور محتاط اہل علم نے ہمیشہ تکفیر اہل قبلہ میں سخت احتیاط برتی ہے۔ انہوں نے جن لوگوں کو اپنی تحقیق میں گمراہ سمجھا ان کے خیالات اور عقائد کی تردید نہایت جرأت سے کی۔ کسی کے اقوال و افعال کو اگر اپنے نزدیک کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے خلاف پایا تو اس کا سختی کے ساتھ ابطال کیا۔ جن مقالات میں ان کو کفر و الحاد کی جھلک نظر آئی ان کے متعلق برملا کہا کہ یہ کافرانہ اور ملحدانہ مقالات ہیں۔ جن افعال میں شرک و کفر کے نشانات محسوس ہوئے ان کے متعلق صاف صاف کہہ دیا کہ یہ مشرکانہ اور کافرانہ اعمال ہیں لیکن ضلالت کو ضلالت اور کفر کو کفر اور شرک کو شرک کہنے میں خواہ کتنی ہی جرأت انہوں نے ظاہر کی ہو، مگر ان افعال و اقوال کا ارتکاب کرنے والوں کو "کافر" یا "مشرک" کہدینے میں انہوں نے کبھی جرأت سے کام نہیں لیا۔[1] وہ

[1] یہاں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ کسی شخص کا کافر یا ملحد یا مشرک ہونا اور چیز ہے اور اس کے اقوال یا افعال میں کفر یا الحاد یا شرک ہونا اور چیز۔ انسان کو کافر اس وقت کہا جا سکتا ہے جب کہ وہ اصول دین میں سے کسی اصل کا قطعی منکر ہو جائے۔ اسی طرح وہ ملحد اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ وہ حق تعالیٰ کو ماننے سے صاف انکار کر دے۔ اسی طرح وہ مشرک اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ وہ الوہیت میں دوسروں کو شریک ٹھیرانے کا صحیح طور پر اظہار کرے لیکن یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کے غالب اعتقادات و اعمال اسلام کے مطابق ہوں اور کسی جزئیہ میں اس کی کسی بات سے کفر یا شرک یا الحاد لازم آتا ہو یہی چیز ہے جس کو کفر دون کفر سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کی بنا پر کسی کو کافر کہنا جائز نہیں۔

اس خیال سے کانپ اٹھتے تھے کہ کہیں کسی ایسے شخص کو کافر یا مشرک قرار نہ دے بیٹھیں جو حقیقت میں صاحب ایمان ہو۔ اس لیے جس کلمہ گو کے خیالات میں ان کو کفر و الحاد یا شرک کی جھلک نظر آتی تھی اس کے خیالات کی تردید تو کر دیتے تھے، اور نہ صرف اس کی تفہیم کرتے تھے بلکہ عام مسلمانوں کو بھی اس کے خیالات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے تھے، مگر جب خود اسے کافر یا مشرک قرار دینے کا سوال سامنے آتا تو وہ بعید سے بعید تاویل کر کے بھی اس کو دائرۂ اسلام میں رکھنے کی کوشش کرتے، اور اس وقت تک دین سے خروج اور سلب ایمان کا حکم نہ لگاتے جب تک کہ صریح کفر کا اظہار نہ ہو، ایسا صریح کفر جس میں کسی تاویل کی گنجائش ہی نہ ہو۔ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک ایسے شخص کا معاملہ پیش کیا گیا جو کہتا تھا کہ کوئی کافر دوزخ میں نہ جائے گا۔ امام صاحب کے تلامذہ نے بے تکلف فتویٰ دے دیا کہ یہ شخص کافر ہو گیا کیونکہ یہ قرآن کی تکذیب کر رہا ہے۔ مگر امام صاحب نے فرمایا کہ تکفیر میں جلدی نہ کرو۔ کیا اس کے قول کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی؟ شاگردوں نے عرض کیا کہ ایسے صریح قول کی کیا تاویل ہو سکتی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اس کی ایک تاویل ممکن ہے۔ شاید اس کا خیال یہ ہو کہ جب حشر میں انسان اپنی آنکھوں سے حقیقت کو دیکھ لے گا تو وہ کافر نہ رہے گا بلکہ مومن ہو جائیگا۔ رہا یہ امر دیگر ہے کہ اس وقت کا ایمان نافع نہیں ہے، کیونکہ وہ ایمان بالغیب نہیں، ایمان بالشہادۃ ہے۔ مگر اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ دوزخ میں جانے سے پہلے وہ خدائے واحد کی الوہیت کا مقر ہو چکا ہو گا۔ اس لحاظ سے جو شخص کہتا ہے کہ کوئی کافر دوزخ میں نہ جائے گا اس کی مراد یہ نہیں ہے کہ جن لوگوں نے اس دنیا میں کفر کیا ہے وہ دوزخ میں نہ جائیں گے؛ بلکہ اس کی مراد مطلقاً کفر سے ہے، یعنی بحالت کفر کوئی شخص دوزخ میں داخل نہ ہو گا۔ یہ ایک حق بات ہے پھر اس کے قائل کو تم کافر کیسے کہہ سکتے ہو؟

یہ مسلک تھا سلف صالحین کا۔ اور یہ صرف تقویٰ اور خشیت الٰہی کی بنا پر ہی نہ تھا، بلکہ

عقل اور تدبر کا مقتضیٰ بھی یہی تھا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے، توحید و رسالت کا قائل ہے اور قرآن کو کتاب اللہ تسلیم کرتا ہے، اس کے متعلق بادی النظر میں یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ قصداً کفر کی نیت سے کوئی ایسی بات کہے گا جو عقیدۂ توحید کے خلاف ہو یا رسالت کی مکذب ہو، یا قرآن سے معارض ہو۔ اس قسم کی کوئی بات اگر ایک کافر کے قلم یا زبان سے نکلے تب تو ہم اس کو نیت کفر ہی پر محمول کریں گے، کیونکہ اس سے کفر ہی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن ویسا ہی قول اگر ایک مسلمان کی زبان سے نکلے تو ہم بہت ہی جلد باز ہوں گے اگر اس کے قول کو بھی اسی طرح نیت کفر پر محمول کر دیں۔ کیونکہ ایک مسلمان سے نیت کفر کی توقع نہیں کی جاتی۔ بہت ممکن ہے کہ اس کا قول قرآن کی تعلیم سے معارض ہوتا ہو مگر اس کی نیت قرآن سے معارضہ کرنے کی نہ ہو، یا اس کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس نے جو کچھ کہا ہے وہ قرآن کے خلاف ہے، یا اس نے کسی ایسے معنی میں وہ بات کہی ہو جو درحقیقت قرآن کے خلاف نہیں ہے۔ پھر کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ ہم ایک ایسے شخص کو جو قرآن پر ایمان رکھنے کا اقرار کر رہا ہے، محض ایک ظاہری تعارض کی بنا پر منکر قرآن ٹھیرا دیں؟ اگر ہم خود اس کی کوئی تاویل نہ کر سکتے ہوں تو ہمیں اس سے یا اس کے ہم خیال لوگوں سے پوچھنا چاہیے کہ تمہارے اس قول کا مراد حقیقی کیا ہے، اور اس کے جواب میں اگر وہ کوئی تاویل ایسی پیش کریں جو قرآن سے صریحاً معارض نہ ہوتی ہو، تو اس کو تسلیم کر لینا چاہیے نہ یہ کہ خواہ مخواہ کھینچ تان کر اسے خلاف قرآن ہی ثابت کیا جائے اور ایک ایسے شخص کو زبردستی منکر قرآن ہی قرار دیا جائے جو خود قرآن کے کتاب اللہ ہونے اور اس پر ایمان رکھنے کا اقرار کر رہا ہے۔

کفر اور ایمان کا امتیاز جن امور سے ہوتا ہے ان کی تصریح اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرما دی ہے۔ جو شخص خدا کی وحدانیت اور اس کی اُن صفات کا قائل ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں

اور جو شخص ملائکہ اور کتب آسمانی، اور انبیاء علیہم السلام کی نبوت اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت، اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے، اور یوم الآخر کے برحق ہونے پر اس طریقہ سے ایمان لاتا ہے جس کا اظہار قرآن مجید میں کر دیا گیا ہے، وہ بہرحال مومن ہے، خواہ کلام اور فقہ کے اعتبار سے اس کا مذہب جمہور کے مذہب سے کتنا ہی مختلف ہو۔ تفصیلات اور فروع میں اگر اس کی رائے غلط ہو اور کسی مسئلے یا بعض مسائل میں وہ ضلالت کی حد تک بھی پہنچ جاتا ہو تو آپ اس کی تردید کر سکتے ہیں مگر محض اس بنا پر اس کی تکفیر نہیں کر سکتے کہ اس کی تاویل آپ کی تاویل کے خلاف ہے، یا منطقی اسلوب پر اس کے مقدمات کو مرتب کرنے سے کفر یا الحاد یا زندقہ کا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص عالم کو حادث نہیں مانتا اور مادہ کو قدیم کہتا ہے تو آپ محض اس قول کی بنا پر اسے کافر کہنے کا حق نہیں رکھتے، کیونکہ اللہ اور اس کے رسول نے حدوث اور قدم کی بحث سرے سے چھیڑی ہی نہیں ہے۔ آپ نے خود یہ اصطلاحات وضع کی ہیں، ان کا ایک خاص مفہوم مقرر کیا ہے، اور منطقی استدلال سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عالم کو قدیم کہنے سے خدا کا انکار لازم آتا ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ کوئی شخص آپ کی اس اصطلاح اور اس کے اس خاص مفہوم پر ایمان لائے۔ اور نہ یہ ضروری ہے کہ عالم کو قدیم کہنے سے جو کچھ آپ کے نزدیک لازم آتا ہے وہی اس کے نزدیک بھی لازم آئے، اور وہی اس کی مراد بھی ہو۔ جو شخص عالم کو قدیم کہتا ہے آپ اس سے پوچھیے کہ تو خدا کو عالم اور مادۂ عالم کا خالق مانتا ہے یا نہیں؟ اگر وہ کہے کہ مانتا ہوں تو آپ کو تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ مومن ہے، اور اس کے نزدیک قدم کا وہ مفہوم نہیں ہے جو آپ نے اپنے ذہن میں قرار دیا ہے، اور اس قول سے جو کچھ آپ کے نزدیک لازم آتا ہے وہ اس کے نزدیک لازم نہیں آتا، نہ اس لزوم کا وہ قائل ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس کی اصطلاح غلط ہو۔ ہو سکتا ہے کہ منطقی حیثیت سے اللہ کے مبدع عالم ہونے اور عالم کے قدیم ہونے میں کھلا ہوا

تعارض ہو اور منطق کی نگاہ میں ان دونوں متعارض باتوں کو جمع کرنے والا ایک فاتر العقل انسان قرار پائے۔ مگر دین کی نگاہ میں اس کو کافر اور مسلوب الایمان ٹھیرانے کی کوئی وجہ نہیں۔ کیونکہ خدا نے اس کو حدوث عالم پر ایمان لانے کا مکلف نہیں فرمایا ہے بلکہ خدا کی خالقیت اور مُبدعیت پر ایمان لانے کی تکلیف دی ہے۔ اس بات کو جب وہ مانتا ہے تو آپ کون ہیں کہ اس کو اپنے مسائل کلامیہ پر ایمان لانے کا مکلف ٹھیراتے ہیں ؟

اسی پر دوسرے مسائل کو بھی قیاس کر لیجیے۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ تفصیل کے ساتھ ایک ایک مسئلہ کو لے کر بحث کی جائے۔ ہم دراصل اس قاعدۂ کلیہ کی توضیح کرنا چاہتے ہیں کہ کسی مسلمان کو تاویل اور منطقی استنتاج سے کافر بنانا جائز نہیں ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں ہو سکتا کہ ایک مسلم کی زبان سے کوئی فقرہ سن کر ہم اپنے طور پر اس کا صغریٰ کبریٰ قائم کریں، پھر خود ہی ایک حدا وسط لگائیں اور اس سے ایک نتیجہ نکال کر کہیں کہ وہ شخص دراصل اس نتیجہ کا قائل ہے اور یہ نتیجہ کفر ہے، لہٰذا وہ کافر ہے۔ یہ وہی ظالمانہ فعل ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی کے ساتھ منع فرمایا تھا۔ جنگ کے موقع پر السّلام علیکم لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنے والے کو جن صحابی نے قتل کیا تھا انہوں نے بھی یہی تو کیا تھا کہ منطقی استدلال سے اُسکی نیت معلوم کرنے کی کوشش کی، اور یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ اس نے جھوٹے دل سے کلمہ پڑھا ہے مگر حضورؐ نے فرمایا کہ تو نے اس کا دل تو چیر کر نہیں دیکھا تھا۔ اس کا کلمہ پڑھنا بہرحال دو معنی کا محتمل تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ درحقیقت مسلمان ہو گیا ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ دھوکہ دے رہا ہو۔ آگے چل کر خود اس کے فعل سے یہ متحقق ہو جاتا کہ ان دونوں احتمالات میں سے کونسا احتمال صحیح ہے۔ مگر تیرے پاس علم کا کونسا ذریعہ تھا جس سے تو نے حتماً وجزماً ایک احتمال کو ساقط کر کے فیصلہ کر دیا کہ دوسرا احتمال ہی صحیح ہے، اور اس فیصلہ پر اعتماد کر کے ایک ایسے شخص کو کافر قرار دیدیا

جو ایمان کا اقرار کر رہا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم کو جن لوگوں نے سمجھا تھا، اور جو اللہ کی پکڑ کا خوف اپنے دل میں رکھتے تھے، وہ کبھی مسلمانوں کو کافر بنانے کے لیے حجتیں نہیں ڈھونڈتے تھے۔ بلکہ انہیں یہ فکر رہتی تھی کہ کافروں کو کسی طرح مسلمان بنائیں۔

مگر افسوس کہ متاخرین نے اس معاملہ میں سہل انگاری کی حد کر دی ہے۔ کفر اور الحاد اور زندقے کے ٹھپے بنا کر ہر عالم کے قلمدان میں رکھدیے گئے ہیں۔ اُدھر کسی مسلمان کے قلم یا زبان سے ان کے مشرب کے خلاف کوئی بات نکلی اور ادھر شرح مقاصد اور شرح فقہ اکبر اور النبراس اور الفرق بین الفرق' اور شرح الشفار کی ورق گردانی کر کے جزئیات کی تلاش شروع کر دی گئی، اور جس جزئیہ کی زد میں وہ شخص آگیا اسی کے مطابق تین چار ٹھپوں میں سے کوئی ایک ٹھپہ اس پر لگا دیا گیا۔ اس کے بعد وہ شخص کافر' اس کو کافر نہ ماننے والا کافر، اس کا خون اور اس کا مال مباح، اس کی جورو پر طلاق' اس کے بچے اولاد الحرام، اور تمام مسلمانوں سے نہ صرف اس کے بلکہ اس کو کافر نہ ماننے والوں تک کے تعلقات بھی منقطع۔ گذشتہ چند صدیوں میں یہ تکفیر کا فتنہ اس قدر عام ہوا ہے کہ شاید ہی مشاہیر امت میں سے کوئی ایسا شخص بچا ہوگا جس کو کسی نہ کسی گروہ نے کافر نہ ٹھیرایا ہو۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے دل ایک دوسرے سے پھٹ گئے۔ پہلے کفار اور منافقین کی شان یہ تھی کہ تحسبھم جمیعًا و قلوبھم شتّٰی۔ مگر اس کفر بازی کی بدولت وہی حال مسلمانوں کا ہوگیا۔ ان کی جمعیت پراگندہ ہوگئی۔ وہ الفت، وہ اتحاد، وہ ہمدردی، وہ تعاون جس سے اللہ نے نعمت ایمان کے ساتھ ہی اس قوم کو سرفراز کیا تھا، سب رخصت ہوا۔ اور ایک مرتبہ پھر یہ قوم اُسی آگ کے گڑھے پر پہنچ گئی جس سے اس کو نکالا گیا تھا۔

اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ علمائے دین میں کافروں کو مسلمان بنانے کا اتنا ذوق نہیں جتنا

مسلمانوں کو کافر بنانے کا ذوق ہے۔ اچھے خاصے مسلمان جو ضروریات دین کے قائل ہیں، جن کے قول اور عمل سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ نہ صرف ما جاء بہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں بلکہ ذات محمدی کے عاشق ہیں، دین محمدی کے پرستار ہیں، مسلمانوں کے خیرخواہ اور ملت اسلامیہ کے درد مند ہیں، مگر صرف اس بات کے قصوروار ضرور ہیں کہ بعض جزئی و فروعی مسائل میں انہوں نے علماء سے اختلاف کیا ہے، ان کو سزا دینے کا یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ان کی تحریروں میں سے چند فقرے سیاق و سباق سے الگ کر کے نکالے جاتے ہیں، پھر ان منتشر فقروں کو جوڑ کر تاویل القول بما لا یرضیٰ بہ قائلہ کے طریق پر ان کو ایسے معنی پہنائے جاتے ہیں جو خود قائل کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں ہوتے، بلکہ جن کی تردید خود قائل اپنی دوسری تحریروں میں کر چکا ہوتا ہے۔ قائل بیچارہ کہتا ہے کہ حاشا و کلا میرا مقصود یہ نہیں ہے، مگر یہ کہتے ہیں کہ نہیں ہم تیرا دل چیر کر دیکھ چکے ہیں۔ تیرا یہی مقصود ہے، اور منطقی اسلوب پر تیرے مقدمات کو ترتیب دینے سے قطعاً وہی نتیجہ نکلتا ہے جو ہم نے نکالا ہے، اور ہم کو یقین ہے کہ تو اسی نتیجہ کا قائل ہے، لہٰذا تو کافر ہے، زندیق ہے، ملحد ہے، اور جو تجھے ایسا نہ سمجھے وہ بھی کافر ہے، اور جو کسی قومی کام میں تیری اعانت کرے وہ فعل حرام کا مرتکب ہے۔

یہ طریقہ ہے ان حضرات کا جو علماء امتی کا نبیاء بنی اسرائیل کے مصداق سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث تو ضرور پائی، مگر اس میراث میں تصرف کا جو طریقہ اختیار کیا وہ مورث علیہ وعلی آلہ السلام کے خلاف ہے۔ مورث نے یہ میراث اس طرح جمع کی تھی کہ گالیاں اور پتھر کھا کھا کر غیروں کو اپنا بنایا تھا۔ مگر یہ اس میراث کو اس طرح لٹا رہے ہیں کہ اپنوں کو زبان و قلم کے تیر اور پتھر مار مار کر غیر بناتے ہیں۔ اُس ذات پاک کو رات دن یہ فکر تھی کہ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو اس کو ڈھونڈھ کر نکالیں اور

سینے سے لگالیں۔ مگر ان کو نورِ ایمان کی نہیں، ظلمتِ کفر کی تلاش ہے۔ ایک شخص کی ساری زندگی اس کے ایمان پر گواہی دیتی ہے، اس کے تمام اقوال و افعال اس کے اسلام پر شہادت دیتے ہیں۔ مگر یہ ان کو نہیں دیکھتے۔ اس کی تحریروں میں سے صرف چند منتشر فقرے نکال کر اگر کوئی ظالم ان سے استفتا کرتا ہے تو یہ کسی تحقیق و تفتیش کے بغیر نہ صرف اس کو بلکہ اس کے کثیر التعداد متبعین اور اعوان و انصار کو بھی، جو سب کے سب اللہ کی مضبوط رسی میں بندھے ہوئے تھے، مقراضِ افتاء کے ایک ہی وار سے کاٹ کر ملتِ اسلامیہ سے نکال پھینکتے ہیں۔ گویا ہزاروں مسلمانوں کو بیک جنبشِ قلم کافر بنا دینا کوئی ایسی بات ہی نہیں ہے جس میں کسی احتیاط اور تامل کی ضرورت ہو، اور جس کی تحقیق میں چند ساعتوں کی محنت بھی گوارا کرنا ضروری ہو۔

یہ معاملہ ایک دو کے ساتھ نہیں بیسیوں اکابرِ اسلام کے ساتھ پیش آچکا ہے۔ مولانا اسمٰعیل شہید اور ان کے ساتھ لاکھوں مسلمانوں کو اسی طرح کافر بنایا گیا۔ مولانا محمد قاسم کی تحریروں میں بڑی محنت اور تکلف سے کفر کو تلاش کیا گیا اور نہ صرف انکو بلکہ پوری جماعت دیوبند کو نعمت ایمان سے محروم کر دیا گیا۔ سید احمد خاں اور محسن الملک اور حالی اور ان کی پوری جماعت کا رشتہ اسی طرح امتِ مسلمہ سے قطع کر ڈالا گیا۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی اور مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا محمود الحسن اور خدا جانے کن کن کو اسی طرح خلود فی النار کا مستحق بنایا گیا۔ مدت العمر ان لوگوں نے نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، فرائضِ دینی کو نہایت اہتمام سے ادا کیا، دین کی نہ صرف خود پابندی کی بلکہ اس کی تبلیغ اور اعداءِ دین کے مقابلہ میں اس کی حفاظت کے لیے جانیں لڑا دیں، مگر ان میں سے کوئی چیز بھی مفتیوں کی نگاہ میں قابلِ لحاظ نہ تھی۔ لحاظ کے قابل اگر کچھ تھا تو وہ چند الفاظ یا چند فقرے جن کو توڑ مروڑ کر کفر کے سانچے میں ڈھالا جاسکتا تھا۔ کیونکہ دراصل انھیں کافر بنانے ہی کی ضرورت تھی۔ ان کا ایمان مطلوب ہی نہ تھا۔ مسلمانوں کے

جم غفیر کو دیکھتے دیکھتے مفتیوں کے دل بھر چکے تھے اب اس بھیڑ کو چھانٹنے اور کفار کے غول در غول دیکھنے کو دل چاہتا تھا۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسا ذوقِ اشاعتِ اسلام سے تھا، ویسا ہی ذوق اب آنحضور کے جانشینوں کو اشاعت کفر سے ہوگیا ہے۔ وہ وقت گیا جب یدخلون فی دین اللہ افواجًا کا نظارہ دیکھ کر دل ٹھنڈا ہوتا تھا اب تو یخرجون من دین اللہ افواجًا ہی کے منظر سے آنکھوں میں نور اور دل میں سرور آتا ہے!

ارادہ یہ تھا کہ اس تازہ فتوے پر کچھ لکھا جائے جس میں مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی رحمہما اللہ کی تکفیر کی گئی ہے۔ مگر دل کے درد اور روح کے الم نے اتنے صفحے اس طویل تقریر سے رنگین کرا دیے۔ دراصل وہ اذیت ناقابل بیان ہے جو ہمارے دل کو یہ دیکھ کر ہوئی کہ اسلام کے دو سچے خادموں کو ان کی وفات کے برسوں بعد کافر اور ملحد اور زندیق ٹھیرایا گیا ہے، حالانکہ ان میں سے ایک شخص وہ ہے جس نے عمر بھر تاریخ اسلام کی خدمت کی لاکھوں مسلمان اور غیر مسلموں کے دلوں میں اسلام کی گذشتہ عظمت کا سکہ بٹھایا۔ جس کی تحریروں سے ہزاروں بدعقیدہ مسلمان خوش عقیدہ ہوگئے۔ جس نے الفاروق، اور سیرۃ النبی لکھ کر تمام امت پر احسان کیا۔ جس کے دل میں اسلام کا ایسا درد تھا کہ جنگ طرابلس و بلقان کے موقع پر وہ نہ صرف خود تڑپا بلکہ اپنی نظموں اور تقریروں سے لاکھوں مسلمانوں کے دلوں میں بھی غیرت ایمانی کی تڑپ پیدا کر دی۔ دوسرا شخص وہ ہے جس نے مسلسل چالیس برس تک قرآن مجید کی خدمت کی۔ جس نے معارف قرآنی کی تحقیق میں سیاہ بالوں کو سفید کیا۔ جس کی تفسیروں سے عرب و عجم کے ہزاروں مسلمانوں میں تدبر فی القرآن کا ذوق پیدا ہوا۔ جس کی تحریروں کا ایک ایک لفظ گواہی دے رہا ہے کہ وہ قرآن کا عاشق ہے اور اس کے لفظ لفظ پر جان نثار کرتا ہے۔ اگر ایسے لوگ بھی مسلمان نہیں تو اس زمین پر ہم مسلمانوں کو کہاں تلاش کریں؟

یہ دونوں بزرگ کچھ غیر معروف نہ تھے۔ ان کے حالات سب کو معلوم تھے۔ ان کی

زندگیاں سب کے سامنے تھیں۔ ان کے قلم سے نکلے ہوئے ہزاروں صفحات موجود تھے۔ ان سب پر نگاہ ڈال کر معلوم کیا جاسکتا تھا کہ ان کے دل میں ایمان تھا یا نہ تھا۔ زمانہ بھی ایسا نہیں کہ کوئی شخص نفاق کے ساتھ اظہار اسلام پر آمادہ ہو۔ اور اگر بالفرض اب بھی اس کا موقع ہو، تو منافقوں کا یہ کام تو نہیں ہے کہ تاریخ کے اوراق پارینہ میں سے اسلام اور مسلمانوں کی ایک ایک خوبی کو نکال کر چمکائیں یا قرآن مجید کے معارف وحقائق بیان کرکے ایک دنیا کو اس کا شیدائی بنانے کی کوشش کریں۔ یہ سب باتیں شبلی اور حمید الدین کے ایمان کا آفتاب سے زیادہ روشن ثبوت پیش کر رہی تھیں۔ مگر ہمارے مفتیوں کو ان میں سے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ ان کے سامنے چند فقرے شبلی کے اور چند فقرے حمید الدین کے پیش کیے گئے، بالکل اسی طرح جس طرح اس سے پہلے چند فقرے مولانا محمد قاسم کے اور چند فقرے مولانا اشرف علی کے بھی پیش کیے جاچکے ہیں۔ مفتیوں نے ان فقروں کو دیکھتے ہی بے تکلف حکم لگادیا کہ نہ صرف یہ فقرے موجب کفر ہیں بلکہ ان کے قائل قطعاً کافر، ملحد، زندیق، منکر خدا ورسالت، منکر قرآن، شاتم رسول، اور کعب بن اشرف کی سی سزا کے مستحق ہیں۔ اور جو ان کو ایسا نہ سمجھیں، اور ان سے بیزاری کا اظہار نہ کریں وہ بھی کافر ہیں۔ اور جو لوگ ان کے مشن کی مالی امداد کریں یا ان کے رسائل کو خریدیں یا ان کے مدرسے میں اپنے بچوں کو بھیجیں وہ فعل حرام کے مرتکب ہیں! اب پوچھیے کہ آخر اس فتوے کا فائدہ کیا ہے؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ علماء دیوبند اور جماعت ندوہ میں دشمنی پیدا ہو، مسلمانوں میں ندوہ اور دار المصنفین اور مدرسۃ الاصلاح کی طرف سے بدگمانی پھیلے۔ جو مفید کام مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین رحمہما اللہ کے تلامذہ کر رہے ہیں اس کو نقصان پہنچے، اور اس خستہ حالی کے دور میں چند اللہ کے بندے ہر قسم کی مشکلات کا مقابلہ کرکے اسلام کی جو خدمت کر رہے ہیں اس کی مدد سے بھی مسلمان ہاتھ کھینچ لیں۔ کیسا مفید کام

ہے، کیسے ثواب کا کام ہے جو حاملین شریعت کے مبارک ہاتھوں سے انجام پایا ہے!۔

سب سے زیادہ رنج یہ دیکھ کر ہوا کہ اس گناہ عظیم کا ارتکاب معمولی پیشہ ور مولویوں نے نہیں بلکہ ہندوستان کے ان اکابر علماء نے کیا ہے جن کے علم و فضل اور تقویٰ و خشیّت سے یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ ایسے امر خطیر کا ارتکاب کرنے سے پہلے اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں گے، مثلاً مولنا اشرف علی صاحب تھانوی، مولنا شبیر احمد صاحب عثمانی اور مولنا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند۔ ان حضرات نے مولنا شبلی اور مولنا حمید الدین کی تکفیر میں جس سہل انگاری سے کام لیا ہے اس سے تو یہ شبہہ ہوتا ہے کہ اب ایک مسلمان کی تکفیر ایک چیونٹی کو مار دینے سے بھی زیادہ سہل ہو گئی ہے۔ دو مرحوم مسلمانوں کو کافر ثابت کرنے کے لیے کم و بیش ۲۶ کتابوں کی تو ورق گردانی کی جاسکتی ہے، اور ان میں سے تقریباً دس صفحات کی عبارتیں بھی نقل کی جاسکتی ہیں، مگر اتنی زحمت نہیں اٹھائی جاسکتی کہ خود ان دونوں کی اصل تحریروں کو پڑھ کر ان کے سیاق و سباق اور موقع و محل سے ان کا مقصد اور ان کی نیت معلوم کرلی جاتی۔ معمولی فوجداری مقدمات میں بھی وہ لوگ جن کو خدا کے سامنے اپنی جوابدہی کا یقین نہیں ہے، کسی شخص کے مجرد فعل یا قول پر حکم نہیں لگاتے، بلکہ اس کے عام طرز عمل کو دیکھتے ہیں، اس کی سابقہ روش پر نظر ڈالتے ہیں، ان حالات کا لحاظ کرتے ہیں جن میں کوئی فعل کیا گیا ہو، اور اگر کوئی تحریر معرض بحث میں ہو تو پوری تحریر کو دیکھ کر اس کے مقصود و مدعا کی تحقیق کرتے ہیں۔ ازالہ حیثیت عرفی، یا توہین عدالت، یا بغاوت کے معمولی مقدمات میں بھی کہیں یہ نہیں ہوتا کہ اصل تحریر سے الگ کرکے چند فقروں کو لے لیا جائے اور ان پر کوئی حکم لگایا جائے، مگر علمائے اسلام کا یہ حال ہے کہ دو مشہور مسلمانوں پر اسلامی قانون کی انتہائی سزا، دین و ایمان کی سزائے موت کا فتویٰ صادر کرنے بیٹھتے ہیں، اور مجرد چند فقروں

حکم لگا دیتے ہیں، حالانکہ وہ مسلمان غیر معروف نہیں ہیں، ان کے حالات معلوم کرنے کے کثیر ذرائع موجود ہیں جن کو دیکھ کر ان کے دین و ایمان کا حال معلوم کیا جا سکتا ہے، خود وہ کتاب اور وہ رسالہ بھی بآسانی دستیاب ہو سکتا ہے جس سے وہ فقرے اخذ کیے گئے ہیں۔ کیا یہی عمل ہونا چاہیے ان لوگوں کا جو یقین رکھتے ہیں کہ ہم کو ایک روز اپنے خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے؟

مولانا شبلی کے جن فقروں پر کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا ہے وہ ان کی کتاب "الکلام" سے ماخوذ ہیں۔ یہ کتاب تمام تر ملاحدہ اور مادہ پرستوں کے رد میں لکھی گئی ہے اور اس کا مقصد وجود باری، صفات باری، نبوت، اور جزا و سزائے آخرت کا اثبات ہے مصنف نے یہ دیکھا کہ جدید فلسفہ و سائنس سے جو شکوک لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو رہے ہیں ان کو دور کرنے کے لیے قدیم علم کلام کے دلائل کافی نہیں ہیں اس لیے ایک نئے طرز پر علم کلام کو مرتب کرنا چاہیے اس غرض کے لیے انہوں نے "الکلام" تصنیف کی۔ اگرچہ ہم کو ان تمام باتوں سے اتفاق نہیں ہے جو انہوں نے اس کتاب میں لکھی ہیں۔ مگر پوری کتاب میں ایک بات بھی ایسی نہیں جس میں الحاد کا شائبہ بھی پایا جاتا ہو۔ بلکہ اس کو پڑھنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف پکا مومن ہے، اور ایسا مومن ہے جسے دوسرے مسلمانوں کے ایمان کو بچانے کی لگن لگی ہوئی ہے۔

کتاب کے پہلے باب کا عنوان ہے "علوم جدیدہ اور مذہب"۔ اس کی ابتدا ان فقروں سے ہوتی ہے:۔

"تمام دنیا میں غل مچ گیا ہے کہ علوم جدیدہ نے مذہب کی بنیاد متزلزل کر دی ہے، فلسفہ اور مذہب کے معرکے میں ہمیشہ اس قسم کی صدائیں بلند ہوتی رہی ہیں اور اس لحاظ سے یہ کوئی نیا واقعہ نہیں۔ لیکن آج یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ فلسفہ قدیمہ قیاسات

اور ظنیات پر مبنی تھا اس لیے وہ مذہب کا استیصال نہ کرسکا۔ بخلاف اس کے فلسفہ جدیدہ تمام تر تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہے اس لیے مذہب کسی طرح اس کے مقابلہ میں جانبر نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک عام صدا ہے جو یورپ سے اٹھ کر تمام دنیا میں گونج اٹھی ہے لیکن ہم کو غور سے دیکھنا چاہیے کہ اس دعویٰ واقعیت میں مغالطہ کا کس قدر حصہ شامل ہو گیا ہے" (الکلام صفحہ ۷)۔

اس کے بعد مصنف نے ثابت کیا ہے کہ علوم جدیدہ میں جو چیزیں قطعی اور یقینی ہیں وہ کسی حیثیت سے بھی مذہب کی مخالف نہیں ہیں۔ اور جو چیزیں مذہب کی مخالف ہیں وہ قطعی نہیں ہیں بلکہ ظنیات اور فلسفیانہ قیاسات ہیں جن کو یقینی کہنے کی جرأت خود اہل یورپ میں بھی نہیں۔ سائنس کی رو سے مذہب کے خلاف زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ مذہب جن امور پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے ان کے متعلق تجربہ و مشاہدہ سے نفیاً یا اثباتاً کچھ نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ وہ حس اور مشاہدہ سے ماوراء ہیں۔ لیکن کوئی سائنس داں "عدم علم" کے اعتراف سے آگے بڑھ کر یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ خدا نہیں ہے، یا فرشتے نہیں ہیں، یا نبوت اور وحی اور حشر کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس بحث کے سلسلہ میں مولانا لکھتے ہیں کہ

"یہ ہے ماہرین فن کی رائے، لیکن بعض کم درجہ کے مادیین اپنی حد سے بڑھ کر نفی کا دعویٰ بھی کر بیٹھتے ہیں اور انہی کی ملمع کاریاں ہیں جس نے ہمارے ملک کے نوجوانوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے" (الکلام صفحہ ۱۰)۔

کیا یہ کسی ملحد اور زندیق کے خیالات ہو سکتے ہیں؟

بعد کے ابواب میں مصنف نے ثابت کیا ہے کہ مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہے، مذہب اسلام عین فطری مذہب ہے، اس مذہب میں کوئی چیز عقل کے خلاف نہیں، اور عقل ہی کا

تقاضا ہے کہ اسلام کو قبول کیا جائے۔ اس کے بعد وجود باری کی بحث ہے جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ وجود باری کے اثبات میں جو طریقہ فلاسفہ اور متکلمین نے اختیار کیا ہے وہ محکم اور اطمینان بخش نہیں ہے۔ بہترین استدلال قرآن مجید کا ہے، اور موجودہ زمانے کے بڑے بڑے حکما بھی ذات باری کے جو قائل ہوئے ہیں، تو اسی طرز استدلال سے ہوئے ہیں نہ کہ منطقی دلائل سے۔

اس کے بعد مصنف نے ملاحدۂ قدیم و جدید کے اعتراضات نقل کیے ہیں اور ان کے جوابات دئے ہیں۔ اسی بحث کے چند فقرات نقل کر کے مولانا پر الزام لگایا گیا ہے کہ وہ ملحد ہیں۔ حالانکہ یہ فقرے دراصل ملاحدہ کے اعتراضات ہیں جن کو مولانا نے جواب دینے کی غرض سے نقل کیا ہے۔ باب کے عنوان ہی پر لکھا ہوا ہے کہ "ملاحدہ یعنی منکرین خدا کے اعتراضات" اس کے بعد ذیلی عنوان ہے "مادّیین کس بنا پر خدا کے قائل نہیں"۔ اس عنوان کے تحت ملاحدہ کے جو اقوال نقل کیے گئے ہیں ان کو مولانا کا اپنا عقیدہ قرار دینا نہ صرف ظلم بلکہ صریح افترا ہے۔ اس طریقہ سے تو متکلمین اسلام میں سے ہر ایک کو ملحد اور زندیق ثابت کیا جا سکتا ہے، کیونکہ سب نے دشمنوں کے اقوال نقل کیے ہیں۔ بلکہ امام رازی تو مخالفین کے دلائل اس قوت کے ساتھ نقل کرتے ہیں کہ شائد خود مخالفین نے بھی انہیں اتنی قوت کیساتھ پیش نہ کیا ہوگا۔ پھر ان کے متعلق علمائے اسلام کا کیا فتویٰ ہوگا؟

الکلام صفحہ ۴۲ سے ۹۴ تک کی جتنی عبارتیں استفتاء میں نقل کی گئی ہیں ان سب میں یہ جعل سازی کی گئی ہے کہ یا تو ملاحدہ کے اقوال کو مصنف کی طرف منسوب کیا گیا ہے، یا ان باتوں کو جنہیں مولانا نے استدلال کی غرض سے برسبیل تنزل تسلیم کر کے جواب دیا تھا، مولانا کا اصل عقیدہ قرار دے دیا گیا ہے۔ حالانکہ متکلمین میں یہ طریقہ شائع ہے کہ وہ بسا اوقات

معارضہ کی خاطر خصم کی کسی بات کو تسلیم کرکے اسی کے طریق پر اس کا جواب دیتے ہیں۔اس کی بکثرت مثالیں انکے کلام سے نقل کی جاسکتی ہیں۔

مصنف کا اصل مسلک یہ ہے کہ عالم کے تغیر سے اس کے حدوث پر اور اس کے حدوث سے وجود باری کے وجوب پر جو استدلال متکلمین نے کیا ہے وہ کوئی قوی استدلال نہیں ہے۔مادئین کے پر زور اعتراضات کے سامنے یہ دلائل نہیں ٹھیر سکتے۔وجود باری پر بہترین استدلال وہی ہے جو قرآن میں اختیار کیا گیا ہے، یعنی پہلے انسان کی وجدانی شہادت کو اپیل کیا جائے اور پھر کائنات کے نظم اور اس کی حکیمانہ ترتیب کی طرف توجہ دلائی جائے۔اسی سے خدا کا وجود بھی ثابت ہوتا ہے اور اس کی توحید بھی۔اسی استدلال کی پیروی میں جدید زمانہ کے خدا پرستوں نے بھی تمام منطقی اور فلسفیانہ دلائل کو چھوڑ کر آثار فطرت کی ترتیب و نظم (Design in Nature) سے وجود باری پر استدلال کیا ہے جس کا جواب دینے سے ملاحدہ و مادئین عاجز ہیں۔زمانۂ جدید کے بڑے بڑے حکماء و فلاسفہ نے بھی اسی استدلال کے آگے سر جھکایا ہے۔اس کی تفصیلی بحث الکلام میں دو مقامات پر ہے۔ایک بحث کا عنوان ہے۔"وجود باری پر قرآن مجید کا طریقہ استدلال" (صفحہ ۲۵ تا ۳۹) دوسری بحث کا عنوان ہے "ملاحدہ کے اعتراضات کا جواب" (صفحہ ۵۴ تا ۶۲) ان دونوں بحثوں کو دیکھیے اور اپنے ضمیر سے پوچھیے کہ کیا یہ شخص مادے کی قدامت کا قائل ہے؟ کیا اس کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا خالق کائنات نہیں ہے؟ کیا وہ کہتا ہے کہ لوازم انواع خود بخود پیدا ہوگئے اور خلق عالم میں خدا کا کچھ دخل نہیں؟ کبرت کلمۃ تخرج من افواھکم۔

نبوت کے بارے میں مرحوم مظلوم پر یہ بہتان تراشا گیا ہے کہ وہ نبوت کو ایک اکتسابی چیز مانتے تھے اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ قوائے عقلیہ میں ترقی کرتے کرتے انسان نبوت کے

درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ ایسا کھلا ہوا جھوٹ ہے کہ شاید ہی کوئی بڑے سے بڑا کذاب اس کی جرأت کرسکتا ہو۔ مولانا نے نبوت کی بحث میں تمام تر جو کچھ لکھا ہے امام رازی کی مطالب عالیہ، شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ، امام غزالی کی معارج القدس، اور ابن حزم کی ملل ونحل سے منقول ہے۔ ان کی عبارتیں نقل کرکے مولانا خود اپنی رائے اسطرح ظاہر کرتے ہیں:-

"خدا نے انسان کو جس طرح اور مختلف قوتیں عطا کی ہیں جو بعض افراد میں بالکل نہیں پائی جاتیں اور بعض میں بتفاوت درجات پائی جاتی ہیں، اسی طرح ایک روحانی قوت بھی عطا کی ہے جس کا نام قوت قدسیہ یا ملکۂ نبوت ہے۔ یہ قوت تزکیۂ نفس اور پاکیزگی اخلاق سے تعلق رکھتی ہے۔ جس شخص میں یہ قوت موجود ہوتی ہے وہ اخلاق میں کامل ہوتا ہے اور اپنے اثر سے اور انسانوں کو کامل بنا سکتا ہے۔ یہ شخص کسی سے تعلیم وتربیت نہیں پاتا بلکہ بغیر تعلیم وتعلم کے اس پر حقائق اشیا منکشف ہوجاتے ہیں۔

"نبوت کی اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا جب یہ بات بداہۃً نظر آتی ہے کہ ایک شخص کچھ پڑھا لکھا نہیں ہوتا (مثلاً ہومر اور امراء القیس) اور باوجود اس کے اس درجہ کا فصیح وبلیغ، شاعر یا خطیب، یا صناع یا موجد ہوتا ہے کہ تمام زمانہ میں اس کا جواب نہیں ہوتا، تو کیا یہ بعید ہے کہ خدا بعض افراد کو اس قسم کی قوت قدسیہ عطا کرے کہ ان پر بغیر تعلیم وتعلم کے اخلاق کے حقائق واسرار منکشف ہوجائیں۔ کون اس سے انکار کرسکتا ہے کہ اکثر انبیا، مثلاً حضرت ابراہیمؑ، حضرت عیسیٰؑ، اور جناب رسالتؐ پناہ نے علوم وفنون کی مطلق تعلیم نہ پائی تھی اور باوجود اس کے صرف ہدایت وتلقین کی تاثیر سے دنیا کی حالت بدل دی، اور فلسفۂ اخلاق کے وہ کل صو

اور مسائل تعلیم کیے کہ فلاطون اور ارسطو کا خیال بھی وہاں تک نہ پہنچ سکتا تھا" (الکلام صفحہ ۱۰۲ - ۱۰۳)۔

پھر "محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت" کا عنوان قائم کر کے اس کے نیچے لکھتے ہیں:-

"نبی کی حقیقت جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے اجزائے ذیل سے مرکب ہے۔ خود کامل ہو۔ دوسروں کو کامل کر سکتا ہو۔ اس کے علوم و معارف اکتسابی نہ ہوں بلکہ منجانب اللہ ہوں۔ یہ تمام باتیں جس کمال کے ساتھ آپ کی ذات مبارک میں موجود تھیں کیا ابتدائے آفرینش سے آج تک اس کی کوئی نظیر مل سکتی ہے؟ (الکلام صفحہ ۱۳۰)۔

پھر لکھتے ہیں۔

"اب ہم تفصیل کے ساتھ دکھاتے ہیں کہ عقائد، عبادات، اخلاق، معاشرت کے متعلق آنحضرت نے جو اصول اور مسائل وحی کے ذریعہ سے تلقین فرمائے وہ اس قدر کامل اور اعلیٰ درجہ کے ہیں کہ کسی حکیم اور مقنن کے خیال میں نہیں آئے اور بغیر وحی الٰہی کے کسی کے خیال میں آ ہی نہیں سکتے۔ (الکلام صفحہ ۱۳۳)

غور سے پڑھیے اور بار بار پڑھیے وہ شخص جس کے قلم سے یہ الفاظ نکلے ہیں، کیا یہ وہی شخص ہے جو نبوت کو اکتسابی چیز مانتا ہے؟۔

معجزات کے متعلق مولانا کی ایک عبارت نقل کر کے ان پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ وہ سرے سے معجزے کے صدور ہی کو غیر ممکن، اور خدا کو اعجاز سے عاجز سمجھتے ہیں۔ یہ کھلا ہوا افترا ہے۔ مولانا نے دراصل اشاعرہ کے اس اعتقاد کی تردید کی ہے کہ معجزہ دلیل نبوت ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے جتنے دلائل نقل کیے ہیں، سب کے سب امام رازی کی مطالب

عالیہ سے منقول ہیں۔ مولانا کا اصل مقصود یہ ہے کہ اگر نبوت کے لیے صرف معجزہ ہی کو دلیل اور ذریعۂ شناخت قرار دیا جائے تو اس سے کسی نبی کی نبوت ثابت کرنا مشکل ہے۔ رہی یہ بات کہ مولانا خود معجزات کے قائل ہیں یا نہیں، تو اس کے لیے الکلام کے پورے پندرہ صفحات بہترین شہادت دے سکتے ہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن میں خارق عادت واقعات مذکور ہیں۔ وہ صاف کہتے ہیں کہ قرآن کے ان بیانات کی ایسی تاویل کرنا درست نہیں ہے جن سے یہ واقعات خارق عادت نہیں بلکہ مطابق عادت قرار پائیں۔ ان کے نزدیک معجزات کا انکار "ہٹ دھرمی" ہے (الکلام صفحہ ۱۱۵) وہ تفصیل کے ساتھ منکرین کے دلائل نقل کرکے ان کی تردید کرتے ہیں، اور جدید زمانہ کے تجربات سے خرق عادت کا نہ صرف امکان بلکہ وقوع ثابت کرتے ہیں (الکلام صفحہ ۱۱۶ تا ۱۲۶) ان سب باتوں کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔

"قرآن مجید چونکہ قطعی الثبوت ہے اس لیے اس میں جہاں خرق عادت کا ذکر ہوگا واجب التسلیم ہوگا لیکن پہلے یہ امر نہایت غور اور دقّتِ نظر سے طے کرنا پڑے گا کہ فی الواقع قرآن مجید کے الفاظ اس کے ثبوت میں قطعی الدلالۃ ہیں یا نہیں؟ مفسرین میں جو محقق گذرے ہیں مثلاً قفال، ابومسلم اصفہانی، ابوبکر اصم وغیرہ ان کی تحقیقات کے مطابق قرآن مجید میں بہت کم خرق عادات مذکور ہیں اور جو واقعی مذکور ہیں اُن کی صحت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے" (صفحہ ۱۲۹ - ۱۳۰)۔

کیا یہ وہی شخص ہے جس کو معجزات کا منکر کہا جاتا ہے؟

عذاب و ثواب آخرت کے متعلق مولانا کی ایک نامکمل عبارت نقل کرکے ان پر الزام لگایا گیا ہے کہ وہ حقیقت جنت و دوزخ کے منکر ہیں۔ یہ عبارت الکلام کے صفحہ ۱۳۹ سے

نقل کی گئی ہے مگر اسی سے متصل امام غزالی کی کتاب المضنون بہ علیٰ غیر اہلہ سے جو عبارت مولٰنا نے نقل کی تھی اس کو بے تکلف چھوڑ دیا گیا۔ کیونکہ مقصود بالذات تو شبلی کی تکفیر ہے، اب اگر بالتبع غزالی کی تکفیر بھی آپ سے آپ ہو جائے تو کچھ مضائقہ نہیں! یہ حال ہے ان لوگوں کی جرأت کا اور یہ حال ہے ان کی دیانت کا۔

الکلام میں جزا و سزا کی بحث تمام تر ملاحدہ کے ان اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے کی گئی ہے جو ان کی طرف سے عذاب و ثواب اور جنت و دوزخ پر کیے جاتے ہیں۔ ملاحدہ کہتے ہیں کہ خدا کو تم نے انسان کے سے جذبات رکھنے والا وجود فرض کیا ہے جو نافرمانی پر غصہ میں آجاتا ہے اور انتقام لیتا ہے، اور فرمانبرداری پر خوش ہو جاتا ہے اور انعام دینے لگتا ہے۔ مولانا اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ عذاب و ثواب کی حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ طاعت کا فطری نتیجہ ثواب ہے اور عصیان کا فطری نتیجہ عقاب ہے۔ اس کے ثبوت میں وہ قرآن مجید کی آیات پیش کرتے ہیں اور ان کی وہ تفسیر نقل کرتے ہیں جو امام غزالی نے جواہر القرآن میں لکھی ہے۔ یہ پوری بحث الکلام میں صفحہ ۱۳۹ سے ۱۴۳ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کو غور سے پڑھیے اور فیصلہ کیجیے کہ یہ خیالات کسی کافر و زندیق کے ہیں یا کسی مسلم مومن بالقرآن کے؟

ایک "زندیق" کے اصل عقاید آپ کو معلوم ہو چکے۔ اب دوسرے "زندیق" کی فرد قرار داد جرم دیکھیے۔

مولٰنا حمید الدین مرحوم کی جن عبارتوں پر فتویٰ دیا گیا ہے وہ در اصل ان کی ایک ناتمام یادداشت سے منقول ہیں۔ مولٰنا نے قرآن مجید کا ترجمہ شروع کیا تھا۔ اس کام کے دوران میں جو خیالات ان کے ذہن میں آئے ان کو منتشر طور پر انھوں نے قلم بند کر لیا۔ ان کی وفات کے بعد یہ مسودہ ان کے شاگرد مولانا امین احسن اصلاحی کے ہاتھ آیا اور انھوں نے الاصلاح میں اسے شائع کر دیا

ابتدا میں خود امین احسن صاحب نے یہ تنبیہی نوٹ بھی لکھدیا ہے کہ

"یہ ناتمام حالت میں ہے اسلیے کہیں کہیں عبارت چھوٹی ہوئی ہے بعض جگہ سخت ابہام ہے۔ ناظرین غور سے ملاحظہ فرمائیں۔"

اب یہ معلوم ہو جانے کے بعد بھی کہ یہ ایک شخص کا مرتب مضمون نہیں ہے، بلکہ غیر مرتب اشارات کا مجموعہ ہے، جس میں عبارتیں چھوٹی ہوئی ہیں اور بعض جگہ سخت ابہام بھی ہے، اس کی عبارتوں کو نقل کرنا اور ان سے اس شخص کے عقائد پر استدلال کرنا کھلا ہوا ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ قرآن کے متعلق مولانا حمید الدین کے اصلی خیالات انکے بکثرت مضامین اور رسائل میں موجود ہیں ان سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن اور اس کے نظم اور اس کی ترتیب، اور اس کے اعجاز کے متعلق کیا خیالات رکھتے تھے۔ مگر ان چیزوں میں سے کسی چیز کو نہیں دیکھا جاتا۔ استناد کیا جاتا ہے چند منتشر جملوں سے، اور ان کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ وہ قرآن پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور خود حق تعالیٰ پر طعن کرتے ہیں اس لیے کافر و زندیق ہیں، شاتم رسول ہیں، اور اُسی سزا کے مستحق ہیں جو کعب بن اشرف کو دی گئی تھی! کیا اسی کا نام تقویٰ ہے؟ یہی اللہ سے ڈرنے والوں کی شان ہے؟

تمام اکابر اسلام کا طریقہ یہ رہا ہے کہ اگر کسی مسلم کی زبان سے کوئی ایسا فقرہ نکل جائے جس میں کفر کا شبہہ ہوتا ہو تو دیکھنا چاہیے کہ اس کلام کا کوئی صحیح محمل بھی ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اور اگر معلوم ہو کہ اس کا ایک صحیح محمل بھی ممکن ہے تو حسن ظن سے کام لے کر یہی سمجھنا چاہیے کہ قائل کا مقصود دراصل وہی ہوگا نہ کہ کفر۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا حمید الدین نے جو باتیں لکھی ہیں ان سب کے صحیح محمل بھی موجود ہیں، ان کے تلامذہ ان کے کلام کی تشریح کر رہے ہیں، خود ان کی

سابق تحریروں سے بھی انکے اصل مدعا پر روشنی پڑتی ہے، اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ قرآن پر نہ صرف ایمان رکھتے تھے بلکہ اسکے لفظ لفظ سے انکو عشق تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انکے چند مبہم فقروں کو دیکھ کر ہم یہ رائے قائم کرلیں کہ ان کی نیت قرآن پر اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اور خود اللہ تعالیٰ پر طعن کرنے کی تھی؟ کیا شرح مقاصد اور شرح فقہ اکبر اور شرح الشفاء میں کہیں یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمان کو کافر ہی بنانے پر اصرار کرو، اور اگر اسکی کوئی بات دو معنوں پر محتمل ہو تو صرف اسی احتمال پر زور دو جس سے اس کا کفر ثابت کیا جاسکے۔

اس تمام بحث سے ہمارا مقصد علمائے کرام پر طعن کرنا نہیں ہے۔ ہم ان سب بزرگوں کا دل سے احترام کرتے ہیں۔ مگر تحقیق سے ہم کو معلوم ہوچکا ہے کہ انہوں نے تکفیر کے اس فتوے میں سخت غلطی کی ہے۔ ایک گناہ عظیم کا ارتکاب کیا ہے۔ نہایت بے احتیاطی سے کام لیا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس بار گراں کو لیے ہوے وہ خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوں اور اس عدالت میں ان کی رسوائی ہو۔ اس لیے ہم ان پر انکی غلطی واضح کردینا چاہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ان کو توبہ اور تلافی مافات کی توفیق عطا فرمائے، اور ایسا نہ ہو کہ دنیا کی جھوٹی عزت کا خیال انھیں اعتراف گناہ سے باز رکھے۔ اس کے ساتھ ہم یہ بھی دعا کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ اُن ظالموں کو بھی توبہ کی توفیق بخشے جنہوں نے محض اپنی ذاتی اغراض کے لیے دو مرحوم مسلمانوں پر کفر کا فتویٰ لگوانے کی کوشش کی اور ان کی عبارتوں کو غلط طریقہ سے پیش کرکے علمائے کرام کو دھوکہ دیا۔ خدا ان کی نیتوں کو پاک فرمائے اور انہیں صداقت اور دیانت کے ساتھ کسب حلال کی توفیق دے۔

رسائل و مسائل

سود، پردہ، طلاق اور مہر

(۸)

خاندان کی تنظیم | صنفی میلان کو تمدن کے سنگ بنیاد یعنی خاندان کی تخلیق اور اس کے استحکام کا ذریعہ بنانے کے بعد، اسلام خاندان کی تنظیم کرتا ہے، اور یہاں بھی وہ پورے توازن کے ساتھ قانون فطرت کے تمام پہلوؤں کی وہی رعایت ملحوظ رکھتا ہے جو آپ نے اوپر دیکھی ہے۔ عورت اور مرد کے حقوق متعین کرنے میں جس درجہ عدل و انصاف اس نے ملحوظ رکھا ہے، اس کی تفصیل ہم اس سے پہلے اپنے مضمون "حقوق الزوجین" میں بیان کر چکے ہیں اسکی طرف مراجعت کرنے سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دونوں صنفوں میں جس حد تک مساوات قائم کی جا سکتی تھی، وہ اسلام نے قائم کر دی لیکن وہ اُس مساوات کا قائل نہیں ہے جو قانون فطرت کے خلاف ہو۔ انسان ہونے کی حیثیت سے جیسے حقوق مرد کے ہیں ویسے ہی عورت کے ہیں۔ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ لیکن زوج فاعل ہونے کی حیثیت سے جو ذاتی فضیلت (بمعنی عزت نہیں بلکہ بمعنی غلبہ و تقدم) مرد کو حاصل ہے، وہ اس نے پورے انصاف کے ساتھ مرد کو عطا کی ہے۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (بقرہ ۲۸:) اس طرح عورت اور مرد میں فاضل اور مفضول کا فطری تعلق تسلیم کر کے اسلام نے خاندان کی تنظیم حسب ذیل قواعد پر کی ہے:۔

(۱) خاندان میں مرد کی حیثیت قوّام کی ہے، یعنی وہ خاندان کا حاکم ہے، محافظ ہے،

اخلاق اور معاملات کا نگران ہے، اس کی بیوی اور بچوں پر اس کی اطاعت فرض ہے (بشرطیکہ وہ اللہ اور رسول کی نافرمانی کا حکم نہ دے)، اور اس پر خاندان کے لیے روزی کمانے اور ضروریات زندگی فراہم کرنے کی ذمہ داری ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِھِمْ (النساء: ٦)۔

مرد عورتوں پر قوام ہیں اس فضیلت کی بنا پر جو اللہ نے ایک کو دوسرے پر عطا کی ہے، اور اس بنا پر کہ وہ ان پر (مہر و نفقہ کی صورت میں) اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

الرجل راع علی اھلہ وھو مسئول (بخاری باب قوا انفسکم و اھلیکم نارا، کتاب النکاح)

مرد اپنے بیوی بچوں پر حکمران ہے اور اپنی رعیت میں اپنے عمل پر خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ (النساء: ٦)۔

صالح بیویاں شوہروں کی اطاعت گزار اور اللہ کی توفیق سے شوہروں کی غیبت میں انکے ناموس کی محافظ ہیں

قال النبی صلعم اذا خرجت المرأۃ من بیتھا و زوجھا کارہ لعنھا کل ملک فی السماء وکل شیٔ مرت علیہ غیر الجن والانس حتی ترجع (کشف الغمہ)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب عورت اپنے شوہر کی مرضی کے خلاف گھر سے نکلتی ہے تو آسمان کا ہر فرشتہ اس پر لعنت بھیجتا ہے اور جن و انس کے سوا ہر وہ چیز جس پر وہ گزرتی ہے، اس پر پھٹکار بھیجتی ہے تاوقتیکہ وہ واپس نہ ہو۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَکُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْھِنَّ سَبِیْلًا (النساء، ٦)

اور جن بیویوں سے تم کو سرکشی و نافرمانی کا خوف ہو ان کو نصیحت کرو (نہ مانیں تو) خوابگاہوں میں ان سے ترک تعلق کرو (پھر بھی باز نہ آئیں تو) مارو، پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان پر زیادتی کرنے کیلیے کوئی بہانہ نہ نکالو۔

وَقَالَ النَّبِیُّ صلعم لا طاعة لِمَنْ لمر يطع الله (رواہ احمد من حديث معاذ) ولا طاعة فی معصیة اللهِ (رواہ احمد من حدیث عمران بن حصین) انما الطاعة فی المعروف (بخاری کتاب الاحکام)۔	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص خدا کی اطاعت نہ کرے اس کی اطاعت نہ کی جائے۔ اللہ کی نافرمانی میں کسی شخص کی فرمانبرداری نہیں کی جا سکتی۔ فرمانبرداری صرف امر معروف میں ہے۔
وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا فَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا (العنکبوت: ۲۹)	اور ہم نے انسان کو ہدایت کی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ ادب سے پیش آئے لیکن اگر وہ تجھکو حکم دیں کہ میرے ساتھ کوئی شریک ٹھیرائے جس کے لیے تیرے پاس کوئی دلیل ہی نہیں ہے تو اس باب میں ان کی اطاعت نہ کر۔

اس طرح خاندان کی تنظیم اس طور پر کی گئی ہے کہ اس کا ایک سردھرا اور صاحب امر ہو۔ جو شخص اس نظم میں خلل ڈالنے کی کوشش کرے اس کے حق میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ وعید ہے کہ

من افسد امرأة علی زوجها فلیس منا (کشف الغمہ)	جو کوئی کسی عورت کو اس کے شوہر کے خلاف نافرمانی پر آمادہ کرے اس کا ہم سے کچھ تعلق نہیں۔

(۲) اس تنظیم میں عورت کو گھر کی ملکہ بنایا گیا ہے۔ کسب مال کی ذمہ داری اس کے شوہر پر ہے، اور اس مال سے گھر کا انتظام کرنا اس کا کام ہے۔

المرأة راعیةٌ علی بیت زوجها وهی مسئولة۔ (بخاری باب قوا انفسکم واھلیکم نارا)۔	عورت اپنے گھر کی حکمران ہے اور وہ اسکی جوابدہ ہے۔

(۳) اولاد پر باپ کے بعد ماں کا ادب اور اس کی اطاعت فرض ہے:۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِىْ عَامَيْنِ (لقمٰن:۲) اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے حق میں ادب و اطاعت کی تاکید کر دی ہے۔ اس کی ماں نے اس کو جھٹکے پر جھٹکے اٹھا کر پیٹ میں رکھا پھر دو سال کے بعد وہ ماں کی چھاتی سے جدا ہوا۔

(۴) عورت کو ایسے تمام فرائض سے سبکدوش کیا گیا ہے جو بیرون خانہ کے امور سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً۔

اس پر نماز جمعہ واجب نہیں (ابو داؤد۔ باب الجمعۃ للمملوک والمراۃ)۔

اس پر جہاد بھی فرض نہیں اگرچہ بوقت ضرورت وہ مجاہدین کی خدمت کے لیے جا سکتی ہے جیسا کہ آگے چل کر بتحقیق بیان ہوگا۔

اس کے لیے جنازوں کی شرکت بھی ضروری نہیں بلکہ اس سے روکا گیا ہے (بخاری۔ باب اتباع النساء الجنازہ)۔

اس پر نماز باجماعت اور مسجدوں کی حاضری بھی لازم نہیں کی گئی۔ اگرچہ چند پابندیوں کے ساتھ مسجدوں میں آنے کی اجازت ضرور دی گئی ہے لیکن اس کو پسند نہیں کیا گیا (ابو داؤد۔ باب ما جاء فی خروج النساء الی المساجد)۔

اس کو محرم کے بغیر سفر کرنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ (ترمذی۔ باب ما جاء فی کراھیۃ ان تسافر المراۃ وحدھا۔ وابو داؤد باب فی المراۃ تحج بغیر محرم)۔

غرض ہر طریقہ سے عورت کے گھر سے نکلنے کو ناپسند کیا گیا ہے اور اس کے لیے قانون اسلامی میں پسندیدہ صورت یہی ہے کہ وہ گھر میں رہے وَقَرْنَ فِىْ بُيُوْتِكُنَّ[1] (تم اپنے گھر میں

[1] بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے لیے خاص ہے۔ بقیہ حاشیہ ۶۲ پر صفحہ

جمی بیٹھی رہو۔ (الاحزاب رکوع ۴) لیکن اس باب میں زیادہ سختی اس لیے نہیں کی گئی کہ بعض حالات میں عورتوں کے لیے گھر سے نکلنا ضروری ہوجاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک عورت کا کوئی سردھرانہ ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ محافظ خاندان کی مفلسی، قلت معاش، بیماری معذوری یا اور ایسے ہی وجوہ سے عورت باہر کام کرنے پر مجبور ہوجائے۔ ایسی تمام صورتوں کے لیے

بقیہ حاشیہ صہ ۶۱۔ کیونکہ آیت کی ابتدا یا نساء النبی سے کی گئی ہے لیکن اس پوری آیت میں جو ہدایات دی گئی ہیں ان میں سے کونسی ہدایت ایسی ہے جو امہات مومنین کے ساتھ خاص ہو؟ فرمایا گیا ہے "اگر تم پرہیزگار ہو تو دبی زبان سے لگاوٹ کے انداز میں کسی سے بات نہ کرو تاکہ جس شخص کے دل میں کھوٹ ہو وہ تمہارے متعلق کچھ امیدیں اپنے دل میں نہ پال لے جو بات کرو سیدھے سادھے انداز میں کرو۔ اپنے گھروں میں جمی بیٹھی رہو۔ جاہلیت کے سے بناؤ سنگھار نہ کرتی پھرو۔ نماز پڑھو۔ زکوٰۃ دو۔ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ چاہتا ہے کہ تم سے گندگی کو دور کر دے۔" ان ہدایات پر غور کیجیے! ان میں کونسی چیز ہے جو عام مسلمان عورتوں کے لیے نہیں ہے؟ کیا مسلمان عورتیں پرہیزگار نہ بنیں؟ کیا وہ غیر مردوں سے لگاوٹ کی باتیں کیا کریں؟ کیا وہ جاہلیت کے سے بناؤ سنگھار کرتی پھریں کیا وہ نماز و زکوٰۃ اور اطاعت خدا و رسول سے انحراف کریں؟ کیا اللہ تعالیٰ ان کو گندگی میں مبتلا رکھنا چاہتا ہے؟ اگر یہ ہدایات سب مسلمان عورتوں کے لیے عام ہیں تو صرف وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ کو ازواج نبی کے لیے خاص کرنے کی کیا وجہ ہے؟ دراصل غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ آیت کی ابتدا میں لوگوں کو یہ الفاظ نظر آتے ہیں کہ "اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو"۔ لیکن یہ انداز بیان اس طرح کا ہے جیسے کسی شریف بچے سے کہا جائے کہ "تم کوئی عام بچوں کی طرح تو نہیں کہ بازاروں میں گھومو اور بیہودہ حرکات کرو، تمہیں تمیز سے رہنا چاہیے"۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ دوسرے بچوں کے لیے بازاری پن اور بیہودہ حرکات پسندیدہ ہیں اور خوش تمیزی ان کے حق میں مطلوب نہیں بلکہ اس سے حسن اخلاق کا ایک معیار قائم کرنا مقصود ہے تاکہ ہر وہ بچہ جو شریف بچوں کی طرح رہنا چاہتا ہو اس معیار پر پہنچنے کی کوشش کرے۔ یہ انداز بیان اس لیے اختیار کیا گیا کہ عرب جاہلیت کی عورتوں میں ویسی ہی آزادی تھی جیسی اس وقت یورپ میں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے بتدریج ان کو اسلامی تہذیب کا خوگر بنایا جا رہا تھا اور ان کے لیے اخلاقی حدود اور ضوابط معاشرت کی قیود مقرر کی جا رہی تھیں۔ اس حالت میں امہات المومنین کی زندگی کو خاص طور پر منضبط کیا گیا تاکہ وہ دوسری عورتوں کے لیے نمونہ بن جائیں اور عام مسلمانوں کے گھروں میں ان کے طریقوں کی تقلید کی جائے۔

قانون میں کافی گنجایش رکھی گئی ہے :-

قد اذن اللہ لکن ان تخرجن لحوائجکن (بخاری باب خروج النساء لحوائجھن یعنی ھذا المعنی حدیث فی الصحیح المسلم باب اباحۃ الخروج للنساء لقضاء حاجۃ الانسان)

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اجازت دی ہے کہ تم اپنی ضروریات کے لیے گھر سے نکل سکتی ہو۔

مگر اس قسم کی اجازت جو محض حالات اور ضروریات کی رعایت سے دی گئی ہے، اسلامی نظام معاشرت کے اس قاعدہ میں ترمیم نہیں کرتی کہ عورت کا دائرۂ عمل اس کا گھر ہے۔ یہ محض ایک وسعت اور رخصت ہے اور اس کو اسی حیثیت میں رہنا چاہیے۔

(۵) بالغ عورت کو اپنے ذاتی معاملات میں کافی آزادی بخشی گئی ہے، مگر اس کو اس حد تک خود اختیاری عطا نہیں کی گئی جس حد تک بالغ مرد کو عطا کی گئی ہے۔ مثلاً مرد اپنے اختیار سے جہاں چاہے جا سکتا ہے لیکن عورت خواہ کنواری ہو یا شادی شدہ یا بیوہ، ہر حال میں ضرورت ہے کہ سفر میں اس کے ساتھ ایک محرم ہو۔

لایحل لامرأۃ تومن باللہ والیوم الاخر ان تسافر سفراً یکون ثلثۃ ایام فصاعداً الا ومعھا ابوھا او اخوھا او زوجھا او ابنھا او ذو محرم منھا۔

کسی عورت کے لیے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتی ہو یہ حلال نہیں کہ وہ تین دن یا اس سے زیادہ کا سفر کرے بغیر اس کے کہ اس کے ساتھ اس کا باپ یا بھائی یا شوہر یا بیٹا یا کوئی اور محرم مرد ہو۔

وعن ابی ھریرہ عن النبی صلعم انہ قال لا تسافر المرأۃ مسیرۃ یوم ولیلۃ الا ومعھا محرم والعمل علیٰ ھذا عند اھل العلم (ترمذی ما جاء فی کراھیۃ ان تسافر المرأۃ وحدھا)

اور حضرت ابو ہریرہ کی روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ہے کہ حضور نے فرمایا عورت ایک دن رات کا سفر نہ کرے جب تک کہ اس کے ساتھ کوئی محرم مرد نہ ہو۔

وعن ابی ھریرۃ ایضاً انہ صلعم قال لایحل لامرأۃ مسلمۃ تسافر مسیرۃ لیلۃ الا ومعھا رجل ذو حرمۃ منھا (ابوداؤد۔ باب فی المرأۃ تحج بغیر محرم)	اور حضرت ابوہریرہ سے یہ بھی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کسی مسلمان عورت کے لیے حلال نہیں کہ ایک رات کا سفر کرے تاوقتیکہ اس کے ساتھ ایک محرم مرد نہ ہو۔

ان روایات میں جو اختلاف مقدار سفر کی تعیین میں ہے وہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ دراصل ایک دن یا دو دن کا سوال اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ اہمیت صرف اس امر کی ہے کہ عورت کو تنہا نقل و حرکت کرنے کی ایسی آزادی نہ دی جائے جو موجب فتنہ ہو۔ اسی لیے حضور نے مقدار سفر معین کرنے میں زیادہ اہتمام نہ فرمایا، اور مختلف حالات میں وقت اور موقع کی رعایت سے مختلف مقداریں ارشاد فرمائیں۔

مرد کو اپنے نکاح کے معاملہ میں پوری آزادی حاصل ہے۔ مسلمان یا کتابیہ عورتوں میں سے جس کے ساتھ چاہے وہ نکاح کر سکتا ہے، اور لونڈی بھی رکھ سکتا ہے لیکن عورت اس معاملہ میں کلیتہً خود مختار نہیں ہے۔ وہ کسی غیر مسلم سے نکاح نہیں کر سکتی:۔

لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ (الممتحنۃ ۲) نہ یہ ان کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ ان کے لیے حلال

وہ اپنے غلام سے بھی تمتع نہیں کر سکتی۔ قرآن میں جس طرح مرد کو لونڈی سے تمتع کی اجازت دی گئی ہے اس طرح عورت کو نہیں دی گئی۔ حضرت عمر کے زمانہ میں ایک عورت نے ما ملکت ایمانکم کی غلط تاویل کر کے اپنے غلام سے تمتع کیا تھا۔ آپ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے یہ معاملہ صحابہ کی مجلس شوریٰ میں پیش کیا اور سب نے بالاتفاق فتویٰ دیا کہ قبحھا اللہ تاولت کتاب اللہ غیر تاویلہ (اس نے کتاب اللہ کو غلط معنی پہنائے) ایک عورت نے حضرت عمر سے ایسے ہی فعل کی اجازت مانگی تو آپ نے اس کو سخت سزا دی اور فرمایا لن تزال العرب

بخیر ما منعت نسا ؤ ھا۔"عرب کی بھلائی اسی وقت تک ہے جب تک اس کی عورتیں محفوظ ہیں"۔(کشف الغمہ للشعرانی)۔

غلام اور کافر کو چھوڑ کر احرار اسلام میں سے عورت اپنے لیے شوہر کا انتخاب کر سکتی ہے، لیکن اس معاملہ میں بھی اس کے لیے اپنے باپ دادا بھائی اور دوسرے اولیاء کی رائے کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ اگرچہ اولیاء کو یہ حق نہیں کہ عورت کی مرضی کے خلاف کسی سے اس کا نکاح کریں، کیونکہ ارشاد نبوی ہے کہ الایم احق بنفسھا من ولیھا اور لا تنکح البکر حتی تستاذن، مگر عورت کے لیے بھی یہ مناسب نہیں کہ اپنے خاندان کے ذمہ دار مردوں کی رائے کے خلاف جس کے ساتھ چاہے نکاح کرلے۔ اسی لیے قرآن مجید میں جہاں مرد کے نکاح کا ذکر ہے وہاں نکح ینکح کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی نکاح کر لینے کے ہیں، مثلاً وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ اور فَانكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ۔ مگر جہاں عورت کے نکاح کا ذکر آیا ہے وہاں باب افعال سے انکاح کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی نکاح کر دینے کے ہیں مثلاً وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ (النور، ۴) اور وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا (البقرہ: ۲۷)

اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح شادی شدہ عورت اپنے شوہر کی تابع ہے اسی طرح غیر شادی شدہ عورت اپنے خاندان کے ذمہ دار مردوں کی تابع ہے، اور یہ تابعیت اس معنی میں نہیں ہے کہ اس کے لیے ارادہ وعمل کی کوئی آزادی نہیں، یا اپنے معاملہ میں کوئی اختیار نہیں، بلکہ اس معنی میں ہے کہ نظام معاشرت کو اختلال و برہمی سے محفوظ رکھنے اور خاندان کے اخلاق و معاملات کو اندرونی و بیرونی فتنوں سے بچانے کی ذمہ داری مرد پر ہے، اور اس نظم کی خاطر عورت پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ جو شخص اس نظم کا ذمہ دار ہو اس کی اطاعت کرے، خواہ وہ اس کا شوہر ہو، یا باپ یا بھائی۔

عورت کے حقوق | اس طرح اسلام نے بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ کو ایک فطری حقیقت تسلیم کرنے کے بعد لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ کی ٹھیک ٹھیک تعیین کر دی ہے عورت اور مرد میں حیاتیات اور نفسیات کے اعتبار سے جو فرق ہے اس کو وہ بعینہٖ قبول کرتا ہے۔ جتنا فرق ہے اسے جوں کا توں برقرار رکھتا ہے۔ جیسا فرق ہے اسی کے لحاظ سے ان کے مراتب اور وظائف مقرر کرتا ہے۔

اس کے بعد ایک اہم سوال عورت کے حقوق کا ہے۔ ان حقوق کی تعیین میں اسلام نے تین باتوں کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔

ایک یہ کہ مرد کو جو حاکمانہ اختیارات محض نظم عائلی کی خاطر دیے گئے ہیں اُن سے ناجائز فائدہ اٹھا کر وہ ظلم نہ کر سکے، اور ایسا نہ ہو کہ تابع و متبوع کا تعلق عملاً لونڈی اور آقا کا تعلق بن جائے۔

دوسرے یہ کہ عورت کو ایسے تمام مواقع بہم پہنچائے جائیں جن سے فائدہ اُٹھا کر وہ نظام معاشرت کے حدود میں اپنی فطری صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے سکے اور تعمیر تمدن میں اپنے حصے کا کام بہتر سے بہتر انجام دے سکے۔

تیسرے یہ کہ عورت کے لیے ترقی اور کامیابی کے بلند سے بلند درجوں تک پہنچنا ممکن ہو، مگر اس کی ترقی اور کامیابی جو کچھ بھی ہو عورت ہونے کی حیثیت سے ہو۔ مرد بننا نہ تو اس کا حق ہے نہ مردانہ زندگی کے لیے اس کو تیار کرنا اس کے اور نظام تمدن کے لیے مفید ہے، اور نہ مردانہ زندگی میں وہ کامیاب ہو سکتی ہے۔

مذکورۂ بالا تینوں امور کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھ کر اسلام نے عورتوں کو جیسے وسیع تمدنی و معاشی حقوق دیے ہیں اور عزت و شرف کے جو بلند مراتب عطا کیے ہیں اور

ان حقوق اور مراتب کی حفاظت کے لیے اپنی اخلاقی اور قانونی ہدایات میں جیسی پائدار ضمانتیں مہیا کی ہیں ان کی نظیر دنیا کے کسی قدیم و جدید نظام معاشرت میں نہیں ملتی۔

(۱) سب سے اہم اور ضروری چیز جس کی بدولت تمدن میں انسان کی منزلت قائم ہوتی ہے اور جس کے ذریعہ سے وہ اپنی منزلت کو برقرار رکھتا ہے، وہ اس کی معاشی حیثیت کی مضبوطی ہے۔ اسلام کے سوا تمام قوانین نے عورت کو معاشی حقوق سے قطعاً محروم کر دیا ہے اور یہی معاشی بے بسی معاشرت میں عورت کی غلامی کا سب سے بڑا سبب بن گئی ہے۔ یورپ نے اس حالت کو بدلنا چاہا، مگر اس طرح کہ عورت کو ایک کمانے والا فرد بنا دیا۔ یہ ایک دوسری اور عظیم تر خرابی کا سبب بن گیا۔ اسلام بیچ کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ عورت کو وراثت کے نہایت وسیع حقوق دیتا ہے۔ باپ سے، شوہر سے، اولاد سے اور دوسرے قریبی رشتہ داروں سے اسکو وراثت ملتی ہے[۱] نیز شوہر سے اسکو مہر بھی ملتا ہے، اور ان تمام ذرائع سے جو کچھ مال اس کو پہنچتا ہے اسمیں ملکیت اور قبض و تصرف کے پورے حقوق اسے دیے گئے ہیں جن میں مداخلت کرنے کا اختیار نہ اس کے باپ کو حاصل ہے نہ شوہر کو نہ کسی اور کو۔ ان کے علاوہ اگر وہ کسی تجارت میں روپیہ لگا کر، یا خود محنت کر کے کچھ کمائے تو اسکی مالک بھی کلیتہً وہی ہے۔ اور ان سب کے باوجود اس کا نفقہ ہر حال میں اسکے شوہر پر واجب ہے۔ بیوی خواہ کتنی ہی مالدار ہو، اس شوہر کے نفقہ سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ اس طرح اسلام میں عورت کی معاشی حیثیت اتنی مستحکم ہو گئی ہے کہ بسا اوقات وہ مرد سے زیادہ بہتر حال میں ہوتی ہے۔

(۲) عورت کو شوہر کے انتخاب کا پورا حق دیا گیا ہے اسکی مرضی کے خلاف یا اسکی رضامندی کے بغیر کوئی شخص اسکا نکاح نہیں کر سکتا۔ اور اگر وہ خود اپنی مرضی سے کسی مسلم کیساتھ نکاح کرلے تو کوئی اسکو روک نہیں سکتا۔ البتہ اگر اسکی نظر انتخاب کسی ایسے شخص پر پڑے جو اس کے خاندان کے مرتبہ (Social Status) سے گرا ہوا ہو تو صرف اس صورت

---

[۱] وراثت میں عورت کا حصہ مرد کے مقابلہ میں نصف رکھا گیا ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ عورت کو نفقہ اور مہر کے حقوق حاصل ہیں جن سے مرد محروم ہے۔ عورت کا نفقہ صرف اسکے شوہر ہی پر واجب نہیں ہے، بلکہ شوہر نہ ہونے کی صورت میں باپ، بھائی، بیٹے یا دوسرے اولیاء پر اسکی کفالت واجب ہوتی ہے۔ پس جب عورت پر وہ ذمہ داریاں نہیں ہیں جو مرد پر ہیں، تو وراثت میں اس کا حصہ بھی وہ نہ ہونا چاہیے جو مرد کا ہے۔

ہیں اس کے اولیاء کو اعتراض کا حق حاصل ہے۔

(۳) ایک ناپسندیدہ یا ظالم یا ناکارہ شوہر کے مقابلہ میں عورت کو خلع اور فسخ و تفریق کے وسیع حقوق دئے گئے ہیں۔

(۴) شوہر کو بیوی پر جو اختیارات اسلام نے عطا کیے ہیں ان کے استعمال میں حسن سلوک اور فیاضانہ برتاؤ کی ہدایت کی گئی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (عورتوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو)۔ اور وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ (اور آپس کے تعلقات میں فیاضی کو نہ بھول جاؤ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے خیارکم خیارکم لنساءہ ، والطفہم باھلہ (تم میں اچھے لوگ وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے ساتھ اچھے ہیں اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ لطف اور مہربانی کا سلوک کرنے والے ہیں) یہ محض اخلاقی ہدایات ہی نہیں ہیں اگر شوہر اپنے اختیارات کے استعمال میں ظلم سے کام لے تو عورت کو قانون سے مدد لینے کا حق بھی حاصل ہے۔

(۵) بیوہ اور مطلقہ عورتوں اور ایسی تمام عورتوں کو جن کے نکاح از روئے قانون فسخ کیے گئے ہوں یا جن کو حکم تفریق کے ذریعہ سے شوہر سے جدا کیا گیا ہو نکاح ثانی کا غیر مشروط حق دیا گیا ہے اور اس امر کی تصریح کر دی گئی ہے کہ ان پر شوہر سابق یا اس کے کسی رشتہ دار کا کوئی حق باقی نہیں یہ وہ حق ہے جو آج یورپ اور امریکہ کے بیشتر ممالک میں بھی عورت کو نہیں ملا ہے۔

(۶) دیوانی اور فوجداری کے قوانین میں عورت اور مرد کے درمیان کامل مساوات قائم کی گئی ہے۔ جان و مال اور عزت کے تحفظ میں اسلامی قانون عورت اور مرد کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں کرتا۔

(۷) عورتوں کو دینی اور دنیوی علوم سیکھنے کی نہ صرف اجازت دی گئی ہے بلکہ ان کی تعلیم و تربیت کو اسی قدر ضروری قرار دیا گیا ہے جس قدر مردوں کی تعلیم و تربیت ضروری ہے۔ نبی

صلی اللہ علیہ وسلم سے دین و اخلاق کی تعلیم جس طرح مرد حاصل کرتے تھے اسی طرح عورتیں بھی کرتی تھیں۔ آپ نے ان کے لیے اوقات معین فرما دیے تھے جن میں وہ آپ سے علم حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتی تھیں۔ آپ کی ازواج مطہرات، اور خصوصاً حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نہ صرف عورتوں کی، بلکہ مردوں کی بھی معلمہ تھیں اور بڑے بڑے صحابہ و تابعین اُن سے حدیث تفسیر اور فقہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اشراف تو درکنار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لونڈیوں تک کو علم اور ادب سکھانے کا حکم دیا تھا، چنانچہ حضور کا ارشاد ہے کہ

ایما رجل کانت عندہ ولیدۃ فعلمھا فاحسن تعلیمھا وادبھا فاحسن تادیبھا ثم اعتقھا وتزوجھا فلہ اجران (بخاری کتاب النکاح)

جس شخص کے پاس کوئی لونڈی ہو اور وہ اس کو خوب تعلیم دے اور عمدہ تہذیب و شائستگی سکھائے، پھر اس کو آزاد کرکے اس سے شادی کرلے اس کے لیے دوہرا اجر ہے

پس جہاں تک نفس تعلیم و تربیت کا تعلق ہے، اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان کوئی امتیاز نہیں رکھا ہے۔ البتہ نوعیت میں فرق ضروری ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے عورت کی صحیح تعلیم و تربیت وہ ہے جو اس کو ایک بہترین بیوی، بہترین ماں اور بہترین گھر والی بنائے۔ اس کا دائرۂ عمل گھر ہے اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس کو ان علوم کی تعلیم دی جانی چاہیے جو اس دائرے میں اُسے زیادہ سے زیادہ مفید بنا سکتے ہوں۔ مزید برآں وہ علوم بھی اس کے لئے ضروری ہیں جو انسان کو انسان بنانے والے اور اس کے اخلاق کو سنوارنے والے اور اس کی نظر کو وسیع کرنے والے ہیں۔ ایسے علوم اور ایسی تربیت سے آراستہ ہونا تو ہر مسلمان عورت کے لیے لازم ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی عورت غیر معمولی عقلی و ذہنی استعداد رکھتی ہو، اور ان علوم کے علاوہ دوسرے علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کرنا چاہے تو اسلام اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہے، بشرطیکہ وہ اُن حدود سے تجاوز نہ کرے جو شریعت نے عورتوں کے لیے

مقرر کیے ہیں۔

یہ تو صرف معاشی اور تمدنی حقوق ہیں۔ ان سے اُس احسان عظیم کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا جو اسلام نے عورت پر کیا ہے۔ انسانی تمدن کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ عورت کا وجود دنیا میں ذلت، شرم اور گناہ کا وجود تھا بیٹی کی پیدائش باپ کے لیے سخت عیب اور موجب ننگ و عار تھی۔ مصاہرت کے رشتے ذلیل رشتے سمجھے جاتے تھے، حتّٰی کہ سسرے اور سالے کے الفاظ اسی جاہلی تخیل کے تحت آج تک گالی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں بہت سی قوموں میں اسی ذلت سے بچنے کے لیے لڑکیوں کو قتل کر دینے کا رواج ہو گیا تھا[1]۔ جہلا تو درکنار علما اور پیشوایان مذہب تک میں مدتوں یہ سوال زیر بحث رہا کہ آیا عورت انسان بھی ہے یا نہیں؟ اور خدا نے اس کو روح بخشی ہے یا نہیں؟ ہندو مذہب میں ویدوں کی تعلیم کا دروازہ عورت کے لیے بند تھا۔ بودھ مت میں عورت سے تعلق رکھنے والے کے لیے نروان کی کوئی صورت نہ تھی۔ مسیحیت اور یہودیت کی نگاہ میں عورت ہی انسانی گناہ کی بانی مبانی اور ذمہ دار تھی۔ یونان میں گھر والیوں کے لیے علم تھا نہ تہذیب و ثقافت تھی اور نہ حقوق مدنیت۔ یہ چیزیں جب عورت کو ملتی تھیں وہ رنڈی ہوتی تھی۔ روم اور ایران اور چین اور مصر اور تہذیب انسانی کے دوسرے مرکزوں کا حال

---

[1] قرآن اس جاہلی ذہنیت کو نہایت بلیغ انداز میں بیان کرتا ہے:۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۚ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ (النحل: ۷)

اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کے چہرہ پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ زہر کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ اس خبر سے جو شرم کا داغ اس کو لگ گیا ہے اس کے باعث لوگوں سے چھپا چھپا پھرتا ہے اور سوچتا ہے کہ آیا ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہوں یا مٹی میں دبا دوں۔

بھی قریب قریب ایسا ہی تھا۔ صدیوں کی مظلومی ومحکومی اور عالمگیر حقارت کے برتاؤ نے خود عورت کے ذہن سے بھی عزت نفس کا احساس مٹا دیا تھا۔ وہ خود بھی اس امر کو بھول گئی تھی کہ دنیا میں وہ کوئی حق لے کر پیدا ہوئی ہے یا اس کے لیے بھی عزت کا کوئی مقام ہے۔ مرد اس پر ظلم وستم کرنا اپنا حق سمجھتا تھا، اور وہ اس ظلم کو سہنا اپنا فرض جانتی تھی۔ غلامانہ ذہنیت اس حد تک اس میں پیدا کر دی گئی تھی کہ وہ فخر کے ساتھ اپنے آپ کو شوہر کی "داسی" کہتی تھی، "پتی ورتا" اس کا دھرم تھا، اور پتی ورتا کے معنی یہ تھے کہ شوہر اس کا معبود اور دیوتا ہے۔

اس ماحول میں جس نے نہ صرف قانونی اور عملی حیثیت سے بلکہ ذہنی حیثیت سے بھی ایک انقلاب عظیم برپا کیا وہ اسلام ہے۔ اسلام ہی نے عورت اور مرد دونوں کی ذہنیتوں کو بدلا ہے۔ عورت کی عزت اور اس کے حق کا تخیل ہی انسان کے دماغ میں اسلام کا پیدا کیا ہوا ہے۔ آج حقوق نسوان اور تعلیم نسوان اور بیداری اناث کے جو الفاظ آپ سن رہے ہیں، یہ سب اسی انقلاب انگیز صدا کی بازگشت ہیں جو سب سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بلند ہوئی تھی، اور جس نے افکار انسانی کا رخ ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں جنہوں نے دنیا کو بتایا کہ عورت بھی ویسی ہی انسان ہے جیسا مرد ہے۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا۔ (النساء۔ ۱)۔ اللہ نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا اور اسی سے اس کے جوڑے کو پیدا کیا۔

خدا کی نگاہ میں عورت اور مرد کے درمیان کوئی فرق نہیں:-

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (النساء۔ ۵)۔ مرد جیسے عمل کریں ان کے لیے ان کا حصہ ہے اور عورتیں جیسے عمل کریں ان کے لیے ان کا حصہ۔

ایمان اور عمل صالح کے ساتھ روحانی ترقی کے جو درجات مرد کو مل سکتے ہیں وہی

عورت کے لیے بھی کھلے ہوئے ہیں۔ مرد اگر ابراہیم ادہم بن سکتا ہے تو عورت کو بھی رابعہ بصریہ بننے سے کوئی شئے نہیں روک سکتی۔

اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی بَعْضُکُمْ مِّنْ بَعْضٍ (آل عمران ۲)

میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہ کروں گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ تم سب ایک دوسرے کی جنس ہو۔

وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا (النساء۔ ۱۸)۔

اور جو کوئی بھی نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، مگر ہو ایمان دار، تو ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ اور ان پر رتی برابر ظلم نہ ہوگا۔

پھر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، جنہوں نے مرد کو بھی خبردار کیا، اور عورت میں بھی یہ احساس پیدا کیا کہ جیسے حقوق عورت پر مرد کے ہیں ویسے ہی مرد پر عورت کے ہیں۔

لَھُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْھِنَّ (البقرہ۔ ۲۸)

عورت پر جیسے فرائض ہیں ویسے ہی اسکے حقوق بھی ہیں۔

پھر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات ہے جس نے ذلت اور عار کے مقام سے اٹھا کر عورت کو عزت کے مقام پر پہنچایا۔ وہ حضور ہی ہیں جنہوں نے باپ کو بتایا کہ بیٹی کا وجود تیرے لیے ننگ نہیں ہے بلکہ اس کی پرورش اور اس کی حق رسانی تجھے جنت کا مستحق بناتی ہے

من عال جاریتین حتّٰی تبلغا جاء یوم القیٰمۃ انا وھو وضمّ اصابعہٗ (مسلم۔ کتاب البر والصلۃ والادب)

جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بلوغ کو پہنچ گئیں، تو قیامت کے روز میں اور وہ اسطرح آئیں گے جیسے میرے ہاتھ کی یہ دو انگلیاں ساتھ ساتھ ہیں۔

من ابتلی من البنات بشیءٍ فاحسن

جس کے ہاں لڑکیاں پیدا ہوں اور وہ اچھی طرح

إِلَيْهِنَّ كُنَّ لَهُ سترًا مِنَ النارِ (مسلم کتاب البر) — ان کی پرورش کرے تو یہی لڑکیاں اس کے لیے دوزخ سے آڑ بن جائیں گی۔

حضور ہی نے شوہر کو بتایا کہ نیک بیوی تیرے لیے دنیا میں سب سے بڑی نعمت ہے۔

خیر متاع الدنیا المرأة الصالحة (نسائی کتاب النکاح)۔ — دنیا کی نعمتوں میں بہترین نعمت نیک عورت ہے۔

حبب الیَّ من الدنیا النساء والطیب وَجعل قرة عینی فی الصَّلوٰة (نسائی۔ کتاب عشرة النساء)۔ — دنیا کی چیزوں میں مجھ کو سب سے زیادہ محبوب عورت اور خوشبو ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

لیس من متاع الدنیا شیءٌ افضل من المرأة الصالحة (ابن ماجہ۔ کتاب النکاح) — دنیا کی نعمتوں میں کوئی چیز صالح عورت سے بہتر نہیں ہے۔

حضور ہی نے بیٹے کو بتایا کہ خدا اور رسول کے بعد سب سے زیادہ عزت اور قدر و منزلت اور حسن سلوک کی مستحق تیری ماں ہے۔

سأل رجلٌ یا رسول اللہ من احق بحسن صحابتی قال امك قال ثم من قال امك قال ثم من قال امك قال ثم من قال ابوك (بخاری کتاب الادب) — ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ مجھ پر حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟ فرمایا تیری ماں کا۔ اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں! اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں: اس نے پوچھا پھر کون فرمایا تیرا باپ۔

اِنَّ اللہ حرَّمَ علیکم عقوق الامهات (بخاری کتاب الادب)۔ — اللہ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی اور حق تلفی حرام کر دی ہے۔

حضور ہی نے انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ جذبات کی فراوانی، اور حسیات کی نزاکت، اور انتہا پسندی کی جانب میل و انعطاف عورت کی فطرت میں ہے۔ اسی فطرت پر اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے اور یہ انوثت کے لیے عیب نہیں اس کا حسن ہے۔ تم اس سے جو کچھ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہو اس فطرۃ پر قائم رکھ کر اٹھا سکتے ہو۔ اگر اس کو اپنی طرح سیدھا اور سخت بنانے کی کوشش کروگے تو اسے توڑ دوگے (المرأۃ کالضلع ان اقمتھا کسرتھا وان استمتعت بھا استمتعت بھا وفیھا عوج (بخاری۔ باب مدارات النساء)

اس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ پہلے اور درحقیقت آخری شخص ہیں جنھوں نے عورت کی نسبت نہ صرف مرد کی، بلکہ خود عورت کی اپنی ذہنیت کو بھی بدل دیا اور جاہلی ذہنیت کی جگہ ایک نہایت صحیح ذہنیت پیدا کی جس کی بنیاد جذبات پر نہیں بلکہ خالص عقل اور علم پر تھی۔ پھر آپ نے باطنی اصلاح ہی پر اکتفا نہ فرمائی بلکہ قانون کے ذریعہ سے عورتوں کے حقوق کی حفاظت، اور مردوں کے ظلم کی روک تھام کا بھی انتظام کیا اور عورتوں میں اتنی بیداری پیدا کی کہ وہ اپنے جائز حقوق کو سمجھیں اور ان کی حفاظت کے لیے قانون سے مدد لیں۔ سرکار رسالت مآب کی ذات میں عورتوں کو ایک ایسا رحیم و شفیق حامی اور ایسا زبردست محافظ مل گیا تھا کہ اگر ان پر ذراسی بھی زیادتی ہوتی تو وہ شکایت لے کر بے تکلف حضور کے پاس دوڑ جاتی تھیں، اور مرد اس بات سے ڈرتے تھے کہ کہیں ان کو شکایت کا موقع نہ مل جائے۔ حضرت عبد اللہ ابن عمر کا بیان ہے کہ جب تک حضورؐ زندہ رہے ہم اپنی عورتوں سے بات کرنے میں احتیاط کرتے تھے کہ مبادا ہمارے حق میں کوئی حکم نازل نہ ہوجائے۔ جب حضور نے وفات پائی تب ہم نے کھل کر بات کرنی شروع کی (بخاری باب الوصاۃ بالنساء)۔ ابن ماجہ میں ہے کہ حضور نے بیویوں پر دست درازی کرنے کی عام ممانعت فرمادی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت عمر نے شکایت کی کہ

عورتیں بہت شوخ ہو گئی ہیں۔ ان کو مطیع کرنے کے لئے مارنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ آپ نے اجازت دیدی۔ لوگ نہ معلوم کب سے بھرے بیٹھے تھے۔ جس روز اجازت ملی اسی روز ستر عورتیں اپنے گھروں میں پیٹی گئیں۔ دوسرے دن کاشانۂ نبوی پر فریادی عورتوں کا ہجوم ہو گیا۔ سرکار نے لوگوں کو جمع ہونے کا حکم دیا خطبہ دینے کھڑے ہوئے اور فرمایا۔

لقد طاف اللیلة بآل محمد سبعون امرأة کل امرأة تشتکی زوجها فلا تجدون اولئك خیارکم۔

آج محمدؐ کے گھر والوں کے پاس ستر عورتوں نے چکر لگایا ہے۔ ہر عورت اپنے شوہر کی شکایت کر رہی تھی جن لوگوں نے یہ حرکت کی ہے وہ تم میں ہرگز اچھے لوگ نہیں ہیں۔

اسی اخلاقی اور قانونی اصلاح کا نتیجہ ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں عورت کو وہ بلند حیثیت حاصل ہوئی جس کی نظیر دنیا کی کسی سوسائٹی میں نہیں پائی جاتی۔ مسلمان عورت دنیا اور دین میں مادی، عقلی اور روحانی حیثیات سے عزت اور ترقی کے اُن بلند سے بلند مدارج تک پہنچ سکتی ہے جن تک مرد پہنچ سکتا ہے، اور اس کا عورت ہونا کسی مرتبہ میں بھی اس کی راہ میں حارج نہیں ہے۔ آج اس بیسویں صدی میں بھی دنیا اسلام سے بہت پیچھے ہے اور افکار انسانی کا ارتقاء اب بھی اس مقام تک نہیں پہنچا ہے جس پر اسلام پہنچا ہے۔ مغرب نے عورت کو جو کچھ دیا ہے عورت رہتے ہوئے نہیں دیا بلکہ مرد بنا کر دیا ہے۔ عورت درحقیقت اب بھی اس کی نگاہ میں ویسی ہی ذلیل ہے جیسی پرانے دور جاہلیت میں تھی۔ گھر کی ملکہ، شوہر کی بیوی، بچوں کی ماں، ایک اصلی اور حقیقی عورت کے لیے اب بھی کوئی عزت نہیں۔ عزت اگر ہے تو اس مرد مؤنث کے لیے ہے، جو جسمانی حیثیت سے تو عورت، مگر دماغی اور ذہنی حیثیت سے مرد ہو اور تمدن و معاشرت میں مرد ہی کا کام کرے۔ یہ انوثت کی عزت نہیں، رجولیت کی

عزت بے پستی اور دنائت کے احساس (Inferiority Complex) کا کھلا ہوا اظہار یہ ہے کہ مغربی عورت مردانہ لباس فخر کے ساتھ پہنتی ہے، حالانکہ کوئی مرد زنانہ لباس پہنکر برسرعام آنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ بیوی بننا لاکھوں مغربی عورتوں کے نزدیک موجب ذلت ہے، حالانکہ شوہر بننا کسی مرد کے نزدیک ذلت کا موجب نہیں۔ مردانہ کام کرنے میں عورتیں عزت محسوس کرتی ہیں، حالانکہ خانہ داری اور پرورش اطفال جیسے خالص زنانہ کاموں میں کوئی مرد عزت محسوس نہیں کرتا۔ پس بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مغرب نے عورت کو بحیثیت عورت ہونے کے کوئی عزت نہیں دی ہے۔ یہ کام اسلام اور صرف اسلام نے کیا ہے کہ عورت کو تمدن و معاشرت میں اس کے فطری مقام ہی پر رکھ کر عزت و شرف کا مرتبہ عطا کیا، اور صحیح معنوں میں انوثت کے درجہ کو بلند کر دیا۔ اسلامی تمدن عورت کو عورت اور مرد کو مرد رکھ کر دونوں سے الگ الگ وہی کام لیتا ہے جس کے لیے فطرت نے اس کو بنایا ہے، اور پھر ہر ایک کو اس کی جگہ کی مناسبت سے عزت اور ترقی اور کامیابی کے یکساں مواقع بہم پہنچاتا ہے۔ اس کی نگاہ میں انوثت اور رجولیت دونوں انسانیت کے ضروری اجزاء ہیں۔ تعمیر تمدن کے لیے دونوں کی اہمیت یکساں ہے۔ دونوں اپنے اپنے دائرے میں جو خدمات انجام دیتے ہیں وہ یکساں مفید اور یکساں قدر کے مستحق ہیں۔ نہ رجولیت میں کوئی شرف ہے نہ انوثت میں کوئی ذلت۔ جس طرح مرد کے لیے عزت اور ترقی اور کامیابی اسی میں ہے کہ وہ مرد رہے اور مردانہ خدمات انجام دے، اسی طرح عورت کے لیے بھی عزت اور ترقی اور کامیابی اسی میں ہے کہ وہ عورت رہے اور زنانہ خدمات انجام دے۔ ایک صالح نظام تمدن کا کام یہی ہے کہ وہ عورت کو اس کے فطری دائرہ عمل میں رکھ کر پورے انسانی حقوق دے، عزت اور شرف عطا کرے، تعلیم و تربیت سے اس کی

مکنون صلاحیتوں کو چمکائے، اور اسی دائرہ میں اس کے لیے ترقیوں اور کامیابیوں کی راہیں کھولے۔

تحفظات | یہ اسلامی نظام معاشرت کا پورا خاکہ ہے۔ اب آگے بڑھنے سے پہلے اس خاکے کی اہم خصوصیات کو پھر ایک نظر دیکھ لیجیے۔

(۱) اس نظام کا منشا یہ کہ اجتماعی ماحول کو حتی الامکان شہوانی ہیجانات اور تحریکات سے پاک رکھا جائے، تاکہ انسان کی ذہنی وجسمانی قوتوں کو ایک پاکیزہ اور پرسکون فضا میں نشو وارتقار کا موقع ملے اور وہ اپنی محفوظ اور مجتمع قوت کے ساتھ تعمیر تمدن میں اپنے حصہ کا کام انجام دے سکے۔

(۲) صنفی تعلقات تمام تر دائرۂ ازدواج میں محدود ہوں اور اس دائرے کے باہر نہ صرف انتشار عمل کو روکا جائے، بلکہ انتشار خیال کا بھی امکانی حد تک سدباب کر دیا جائے۔

(۳) عورت کا دائرۂ عمل مرد کے دائرہ سے الگ ہو۔ دونوں کی فطرت اور ذہنی وجسمانی استعداد کے لحاظ سے تمدن کی الگ الگ خدمات ان کے سپرد کی جائیں اور ان کے تعلقات کی تنظیم اس طور پر کی جائے کہ وہ جائز حدود کے اندر ایک دوسرے کے مددگار رہیں مگر حدود سے تجاوز کر کے کوئی کسی کے کام میں خلل انداز نہ ہو سکے۔

(۴) خاندان کے نظم میں مرد کی حیثیت قوّام کی ہو اور گھر کے تمام افراد صاحب خانہ کے تابع رہیں۔

(۵) عورت اور مرد دونوں کو پورے انسانی حقوق حاصل ہوں، اور دونوں کو ترقی کے بہتر سے بہتر مواقع بہم پہنچائے جائیں، مگر دونوں میں سے کوئی بھی ان حدود سے تجاوز نہ کر سکے جو معاشرت میں اس کے لیے مقرر کر دی گئی ہیں۔

اس نقشے پر جس نظام معاشرت کی تاسیس کی گئی ہے، اس کو چند ایسے تحفظات کی ضرورت ہے جن سے اس کا نظم اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ برقرار رہے۔ اسلام میں یہ تحفظات تین قسم کے ہیں۔

اصلاح باطن

تعزیری قوانین

انسدادی تدابیر

یہ تینوں تحفظات نظام معاشرت کے مزاج اور اس کے مقاصد کی ٹھیک مناسبت ملحوظ رکھ کر تجویز کیے گئے ہیں، اور مل جل کر اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اصلاح باطن کے ذریعہ سے انسان کی تربیت اس طور پر کی جاتی ہے کہ وہ خود بخود اس نظام معاشرت کی اطاعت پر آمادہ ہو، عام اس سے کہ خارج میں کوئی طاقت اس کو اطاعت پر مجبور کرنے والی ہو یا نہ ہو۔ تعزیری قوانین کے ذریعہ سے ایسے جرائم کا سدباب کیا جاتا ہے جو اس نظام کو توڑنے اور اس کے ارکان کو منہدم کرنے والے ہیں۔ انسدادی تدابیر کے ذریعہ سے اجتماعی زندگی میں ایسے طریقے رائج کیے گئے ہیں۔ جو سوسائٹی کے ماحول کو غیر طبعی ہیجانات اور مصنوعی تحریکات سے پاک کر دیتے ہیں۔ صنفی انتشار کے امکانات کو کم سے کم حد تک گھٹا دیتے ہیں۔ اخلاقی تعلیم سے جن لوگوں کی اصلاح باطن مکمل نہ ہوئی ہو اور جن کو تعزیری قوانین کا خوف بھی نہ ہو ان کی راہ میں یہ طریقے ایسی رکاوٹیں ڈال دیتے ہیں کہ صنفی انتشار کی جانب میلان رکھنے کے باوجود ان کے لیے عملی اقدام بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں یہی وہ طریقے ہیں جو عورت اور مرد کے دائروں کو عملاً الگ کرتے ہیں۔ خاندان کے نظم کو اس کی صحیح اسلامی صورت پر قائم کرتے ہیں اور ان حدود کی حفاظت کرتے ہیں جو عورتوں اور مردوں کی

زندگی میں امتیاز قائم کرنے اور قائم رکھنے کے لیے اسلام نے مقرر کی ہیں۔

یہاں ہمارا مقصد صرف انسدادی تدابیر ہی سے بحث کرنا ہے لیکن تحفظات ثلٰثہ میں سے یہ آخری تحفظ پہلے دونوں تحفظات کے ساتھ ایک گہرا ربط رکھتا ہے، جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس لیے ہم اسی ترتیب کے ساتھ ان تینوں تحفظات کو بیان کریں گے۔

اصلاح باطن | اس سے پہلے ہم اس حقیقت کی طرف بارہا اشارہ کر چکے ہیں کہ اسلام میں اطاعتِ امر کی بنیاد کلیۃً ایمان پر رکھی گئی ہے۔ جو شخص خدا اور اس کی کتاب اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہو وہی شریعت کے اوامر و نواہی کا مخاطب ہے، اور اس کو امر کے امتثال اور نواہی سے اجتناب پر آمادہ کرنے کے لیے صرف اتنا معلوم ہو جانا کافی ہے کہ فلاں امر خدا کا امر ہے اور فلاں نہی خدا کی نہی ہے۔ پس جب ایک مومن کو خدا کی کتاب سے یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ فحش اور بدکاری سے منع کرتا ہے تو اس کے ایمان کا اقتضا یہی ہے کہ وہ اس سے پرہیز کرے اور اپنے دل کو بھی اس کی طرف مائل ہونے سے پاک رکھے۔ اسی طرح جب ایک مومن عورت کو یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ اور اس کے رسول نے معاشرت میں اس کے لیے کیا حیثیت مقرر کی ہے تو اس کے بھی ایمان کا اقتضا یہی ہے کہ وہ برضا و رغبت اس حیثیت کو قبول کرے، اور اپنی حد سے تجاوز نہ کرے۔ اس لحاظ سے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اخلاق اور معاشرت کے دائرے میں بھی اسلام کے صحیح اور قابل اتباع کا مدار ایمان پر ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اخلاق اور معاشرت کے متعلق ہدایات دینے سے پہلے ایمان کی طرف دعوت دی گئی ہے اور دلوں میں اس کو راسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ تو اصلاح باطن کا وہ اساسی ذریعہ ہے جس کا تعلق صرف اخلاقیات ہی سے نہیں بلکہ پورے نظام اسلامی سے ہے۔ اس کے بعد خاص کر اخلاق کے دائرے میں اسلام نے تعلیم و تربیت کا

ایک نہایت حکیمانہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ جس کو مختصراً ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

پہلے اشارۃً یہ کہا جا چکا ہے کہ زنا اور چوری اور جھوٹ اور تمام دوسرے معاصی جن کا ارتکاب فطرت حیوانی کے غلبہ سے انسان کرتا ہے، سب کے سب فطرت انسانی کے خلاف ہیں۔ قرآن ایسے تمام افعال کو "منکر" سے تعبیر کرتا ہے جس کا لفظی ترجمہ "مجہول" یا "غیر معروف" ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ایسے افعال ہیں جن سے فطرت انسانی آشنا نہیں ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جب انسان کی فطرت ان سے نا آشنا ہے، اور حیوانی طبیعت اس پر زبردستی ہجوم کر کے اس کو ان افعال کے ارتکاب پر مجبور کرتی ہے، تو خود انسان ہی کی فطرت میں کوئی ایسی چیز بھی ہونی چاہیے جو تمام منکرات سے نفرت کرنے والی ہو۔ شارع حکیم نے اس چیز کا پتہ چلا لیا ہے۔ وہ اس کو "حیاء" سے تعبیر کرتا ہے۔ حیاء کے معنی شرم کے ہیں۔ اسلام کی مخصوص اصطلاح میں حیاء سے مراد وہ "شرم" ہے جو کسی امر منکر کی جانب مائل ہونے والا انسان خود اپنی فطرت کے سامنے اور اپنے خدا کے سامنے محسوس کرتا ہے۔ یہی حیاء وہ قوت ہے جو انسان کو فحشاء اور منکر کا اقدام کرنے سے روکتی ہے اور اگر وہ جبلت حیوانی کے غلبہ سے کوئی برا فعل کر گذرتا ہے تو یہی چیز اس کے دل میں چٹکیاں لیتی ہے۔ اسلام کی اخلاقی تعلیم و تربیت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ حیاء کے اسی چھپے ہوئے مادے کو فطرت انسانی کی گہرائیوں سے نکال کر علم و معرفت کی غذا سے اس کی پرورش کرتی ہے۔ اور ایک مضبوط حاسۂ اخلاقی بنا کر اس کو نفس انسانی میں ایک کوتوال کی حیثیت سے متعین کر دیتی ہے۔ یہ ٹھیک ٹھیک اس حدیث نبوی کی تفسیر ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ۔ لکل دین خُلُق وخلق الاسلام الحیاء۔ "ہر دین کا ایک خلق ہوتا ہے، اور اسلام کا خلق حیاء ہے"۔ اور وہ حدیث بھی اسی مضمون پر روشنی ڈالتی ہے جس میں سرکار رسالتمآب نے فرمایا ہے کہ اذا لم تستحی فاصنع ما شئت "اگر تجھ میں حیا نہیں ہے تو

جو تیرا جی چاہے کر"۔ کیونکہ جب حیا نہ ہوگی تو خواہش جس کا مبدأ جبلت حیوانی ہے، تجھ پر غالب آجائے گی، اور کوئی منکر تیرے لیے منکر ہی نہ رہے گا۔

انسان کی فطری حیا ایک ایسے اَن گھڑ تا ؤ دے کی حیثیت رکھتی ہے جس نے ابھی کوئی صورت اختیار نہ کی ہو۔ وہ تمام منکرات سے بالطبع نفرت تو کرتی ہے، مگر اس میں سمجھ بوجھ نہیں ہے، اس وجہ سے وہ نہیں جانتی کہ کسی خاص فعل منکر سے اس کو کس لیے نفرت ہے۔ یہی نادانستگی رفتہ رفتہ اس کے احساس نفرت کو کمزور کر دیتی ہے حتیٰ کہ حیوانیت کے غلبہ سے انسان منکرات کا ارتکاب کرنے لگتا ہے اور اس ارتکاب کی ممارست آخر کار حیا کے احساس کو بالکل باطل کر دیتی ہے۔ اسلام کی اخلاقی تعلیم کا مقصد اسی نادانی کو دور کرنا ہے۔ وہ اس کو نہ صرف کھلے ہوئے منکرات سے روشناس کراتی ہے، بلکہ نفس کے چور خانوں تک میں نیتوں اور ارادوں اور خواہشوں کی جو برائیاں چھپی ہوئی ہیں، ان کو بھی اس کے سامنے نمایاں کر دیتی ہے، اور ایک ایک چیز کے مفسدوں سے اس کو خبردار کرتی ہے تاکہ وہ علیٰ وجہ البصیرت اس سے نفرت کرے۔ پھر اخلاقی تربیت اس تعلیم یافتہ شرم و حیا کو اس قدر حساس بنا دیتی ہے کہ منکر کی جانب ادنیٰ سے ادنیٰ میلان بھی اس سے مخفی نہیں رہتا، اور نیت و خیال کی ذرا سی لغزش کو بھی وہ تنبیہ کیے بغیر نہیں چھوڑتی۔

اسلامی اخلاقیات میں حیا کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ اس سے چھوٹا ہوا نہیں ہے۔ تمدن و معاشرت کا جو شعبہ انسان کی صنفی زندگی سے تعلق رکھتا ہے، اس میں بھی اسلام نے اصلاح اخلاق کے لیے اسی چیز سے کام لیا ہے۔ وہ صنفی معاملات میں نفس انسانی کی نازک سے نازک چوریوں کو پکڑ کر حیا کو ان سے خبردار کرتا ہے، اور ان کی نگرانی پر مامور کر دیتا ہے۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں اس لیے ہم صرف چند مثالوں پر اکتفا کریں گے

قانون کی نظر میں زنا کا اطلاق صرف جسمانی اتصال پر ہوتا ہے۔ مگر اخلاق کی نظر میں دائرۂ ازدواج کے باہر صنفِ مقابل کی جانب ہر میلان، ارادے اور نیت کے اعتبار سے زنا ہے۔ اجنبی کے حسن سے آنکھ کا لطف لینا، اس کی آواز سے کانوں کا لذت یاب ہونا، اس سے گفتگو کرنے میں زبان کا لوچ کھانا، اس کے کوچے کی خاک چھاننے کے لیے قدموں کا بار بار اٹھنا، یہ سب زنا کے مقدمات اور خود معنیً زنا ہیں۔ قانون اس زنا کو نہیں پکڑ سکتا۔ یہ دل کا چور ہے اور صرف دل ہی کا کوتوال اس کو گرفتار کر سکتا ہے۔ حدیث نبوی اس چور کی مخبری اس طرح کرتی ہے۔

العینان تزنیان وزناھما النظر (فتح القدیر) — آنکھیں زنا کرتی ہیں اور ان کی زنا نظر ہے۔

والیدان تزنیان وزناھما البطش — اور ہاتھ زنا کرتے ہیں اور ان کی زنا دست درازی ہے

والرجلان تزنیان وزناھما المشی (ابوداؤد باب مایومر بہ من غض البصر) — اور پاؤں زنا کرتے ہیں اور ان کی زنا اس راہ میں چلنا ہے۔

وزنا اللسان المنطق والنفس تمنی وتشتھی والفرج یصدق ذالک کلہ ویکذبہ۔ (بخاری۔ باب زنا الجوارح) — اور زبان کی زنا گفتگو ہے اور نفس تمنا اور خواہش کرتا ہے۔ آخر میں شرمگاہ یا تو ان سب کی تصدیق کر دیتی ہے یا تکذیب۔

نفس کا سب سے بڑا چور نگاہ ہے، اس لیے قرآن اور حدیث دونوں سب سے پہلے اسی کی گرفت کرتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ یَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا یَصْنَعُوْنَ - وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ — اے نبی مومن مردوں سے کہدو کہ اپنی نگاہوں کو (غیر عورتوں کی دید سے) باز رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ

يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ ۔ (النور : ۴)۔ ہے ۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر ہے۔ اور اے نبی مومن عورتوں سے بھی کہدو کہ اپنی نگاہوں کو (غیر مردوں کی دید سے) باز رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

حدیث میں ہے :-

ابن آدم لك اول نظرة وایاك والثانیہ (الجصاص)

اے ابن آدم تیرے لیے پہلی نظر کی اجازت ہے مگر خبردار دوسری نظر نہ ڈالنا۔

حضرت علی سے فرمایا :-

یا علی لا تتبع النظرة النظرة فان لك الاولیٰ ولیس لك الاخرہ۔ (ابوداؤد - باب ما یومر بہ عن غض البصر)

اے علی ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈال پہلی نظر تو معاف ہے، مگر دوسری نظر نہیں۔

حضرت جابر نے پوچھا کہ اچانک نظر پڑ جائے تو کیا کروں ۔ فرمایا فوراً نظر پھیر لو۔ (ابوداؤد باب مذکور)۔

اسی فتنۂ نظر کا ایک شاخسانہ وہ بھی ہے جو عورت کے دل میں یہ خواہش پیدا کرتا ہے کہ اس کا حسن دیکھا جائے ۔ یہ خواہش ہمیشہ جلی اور نمایاں ہی نہیں ہوتی ۔ دل کے پردوں میں کہیں نہ کہیں نمائش حسن کا جذبہ چھپا ہوا ہوتا ہے، اور وہی لباس کی زینت میں، بالوں کی آرائش میں، باریک اور شوخ کپڑوں کے انتخاب میں اور ایسے ایسے خفیف جزئیات تک میں اپنا اثر ظاہر کرتا ہے جن کا احاطہ ممکن نہیں ۔ قرآن نے ان سب کے لیے ایک جامع لفظ استعمال کیا ہے ۔ تبرج جاھلیہ ۔ ہر وہ زینت اور ہر وہ آرائش جس کا مقصد شوہر کے سوا دوسروں کے لیے لذت نظر بننا ہو، تبرجِ جاہلیت کی تعریف میں آجاتا ہے ۔ اگر برقع

بھی اس غرض کے لیے خوبصورت اور خوش رنگ اختیار کیا جائے کہ نگاہیں اس سے لذت یاب ہوں تو یہ بھی تبرج جاہلیت ہے۔ اس کے لیے کوئی قانون نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کا تعلق عورت کے اپنے ضمیر سے ہے۔ اُس کو خود ہی اپنے دل کا حساب لینا چاہیے کہ اس میں کہیں یہ ناپاک جذبہ تو چھپا ہوا نہیں ہے۔ اگر ہے تو وہ اس حکم خداوندی کی مخاطب ہے کہ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ (الاحزاب: ۴) جو آرائش ہر بری نیت سے پاک ہو، وہ اسلام کی آرائش ہے۔ اور جس میں ذرہ برابر بھی بری نیت شامل ہو وہ جاہلیت کی آرائش ہے۔

شیطان نفس کا ایک دوسرا خطرناک ایجنٹ زبان ہے۔ کتنے ہی فتنے ہیں جو زبان کے ذریعہ سے پیدا ہوتے اور پھیلتے ہیں۔ مرد اور عورت بات کر رہے ہیں۔ کوئی برا جذبہ نمایاں نہیں ہے۔ مگر دل کا چھپا ہوا چور آواز میں حلاوت، لہجے میں لگاوٹ، باتوں میں گھلاوٹ پیدا کیے جا رہا ہے۔ قرآن اس چور کو پکڑ لیتا ہے۔

اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوفًا۔ (الاحزاب: ۴)۔

اگر تمہارے دل میں خدا کا خوف ہے تو دبی زبان سے بات نہ کرو کہ جس شخص کے دل میں (بدنیتی کی) بیماری ہوگی وہ تم سے کچھ امیدیں وابستہ کرے گا۔ بات کرو تو سیدھے سادھے طریقہ سے کرو، (جس طرح انسان انسان سے بات کیا کرتا ہے)۔

یہی دل کا چور ہے جو دوسروں کے جائز یا ناجائز صنفی تعلقات کا حال بیان کرنے میں بھی مزے لیتا ہے اور سننے میں بھی۔ اسی لطف کی خاطر عشق و محبت کے افسانے جھوٹ سچ ملا کر جگہ جگہ بیان کیے جاتے ہیں اور سوسائٹی میں ان کی اشاعت اس طرح ہوتی ہے جیسے پوسے پوسے آنچ لگتی چلی جاتی ہے۔ قرآن اس پر بھی تنبیہ کرتا ہے:۔

إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (النور: ۲)۔

جو لوگ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے گروہ میں بےحیائی کی اشاعت ہو ان کے لیے دنیا میں بھی دردناک عذاب ہے اور آخرت میں بھی۔

فتنۂ زبان کے اور بھی بہت سے شعبے ہیں۔ اور ہر شعبہ میں دل کا ایک نہ ایک چور اپنا کام کرتا ہے۔ اسلام نے ان سب کا سراغ لگایا ہے اور ان سے خبردار کیا ہے۔

عورت کو اجازت نہیں کہ اپنے شوہر سے دوسری عورتوں کی کیفیت بیان کرے

لاتباشر المرأة المرأة حتى تصفها لزوجها كانه ينظر اليها۔ (ترمذی باب ما جاء فی کراھیة مباشرة المرأة بالمرأة)

عورت عورت سے خلا ملا نہ کرے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اس کی کیفیت اپنے شوہر سے اس طرح بیان کرے کہ گویا وہ خود اس کو دیکھ رہا ہے۔

عورت اور مرد دونوں کو اس سے منع کیا گیا ہے کہ اپنے پوشیدہ ازدواجی معاملات کا حال دوسرے مردوں کے سامنے بیان کریں، کیونکہ اس سے بھی فحش کی اشاعت ہوتی ہے اور دلوں میں شوق پیدا ہوتا ہے۔ (ابوداؤد۔ باب ما یکرہ من ذکر الرجل ما یکون من اصابته اهله)۔

نماز باجماعت میں اگر امام غلطی کرے، یا اس کو کسی حادثہ پر متنبہ کرنا ہو تو مردوں کو سبحان اللہ کہنے کا حکم ہے۔ مگر عورتوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ صرف دستک دیں زبان سے کچھ نہ بولیں۔ (ابوداؤد باب التصفیق فی الصلوٰة۔ و بخاری باب التصفيق للنساء)

بسا اوقات زبان خاموش رہتی ہے، مگر دوسری حرکات سے سامعہ کو متاثر کیا جاتا ہے۔ اس کا تعلق بھی نیت کی خرابی سے ہے، اور اسلام اس کی بھی ممانعت کرتا ہے۔

وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ

اور وہ اپنے پاؤں زمین پر نہ ماریں کہ جو زینت

مِنْ زِيْنَتِهِنَّ (۲۴:۳۱)۔ انہوں نے چھپا رکھی ہے اس کا حال معلوم ہو۔

خوشبو بھی ان قاصدوں میں سے ایک ہے جو ایک نفس شریر کا پیغام دوسرے نفس شریر تک پہنچاتے ہیں یہ خبر رسانی کا سب سے زیادہ لطیف ذریعہ ہے جس کو دوسرے خفیف سمجھتے ہیں، مگر اسلامی حیاء اتنی حساس ہے کہ اس کی طبع نازک پر یہ لطیف تحریک بھی گراں ہے وہ ایک مسلمان عورت کو اس کی اجازت نہیں دیتی کہ خوشبو میں بسے ہوئے کپڑے پہن کر راستوں سے گذرے یا محفلوں میں شریک ہو، کیونکہ اس کا حسن اور اس کی زینت پوشیدہ بھی ہو تو کیا فائدہ۔ اس کی عطریت تو فضا میں پھیل کر جذبات کو متحرک کر رہی ہے۔

قَالَ النَّبِیُّ صلعم المرأة اذا استعطرت فمرت بالمجلس فھی کذا وکذا یعنی زانیة (ترمذی باب ماجاء فی کراھیة خروج المتعطرة) — نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت جب عطر لگائے اور کسی مجلس سے گذرے تو وہ ایسی اور ایسی ہے، یعنی زانیہ۔

اذا شَهِدَتْ اِحْدٰكُنَّ الْمَسْجِدَ فَلَا تَمَسَّ طيبًا۔ (مؤطاء و مسلم) — جب تم میں سے کوئی عورت مسجد میں جائے تو خوشبو نہ لگائے۔

طيبُ الرِّجَالِ مَا ظَهَرَ رِيحُه وخفی لونُهٗ وطيبُ النساء ما ظهر لونُهٗ وخفی ريحُه (ترمذی باب ماجاء فی طیب الرجال والنساء۔ وابوداؤد۔ باب مایکرہ من ذکر الرجل مایکون من اصابتہ اھلہٗ)۔ — مردوں کے لیے وہ عطر بہتر ہے جس کی خوشبو نمایاں اور رنگ مخفی ہو۔ اور عورتوں کے لیے وہ عطر بہتر ہے جس کا رنگ نمایاں اور خوشبو مخفی ہو۔

ستر عورت کے باب میں اسلام نے انسانی شرم و حیاء کی جس قدر صحیح اور مکمل نفسیاتی تعبیر کی ہے اس کا جواب دنیا کی کسی تہذیب میں نہیں پایا جاتا۔ آج دنیا کی مہذب ترین قومون

کا بھی یہ حال ہے کہ اُن کے مردوں اور ان کی عورتوں کو اپنے جسم کا کوئی حصہ کھول دینے میں باک نہیں۔ ان کے ہاں لباس محض زینت کے لیے ہے۔ ستر کے لیے نہیں ہے۔ مگر اسلام کی نگاہ میں زینت سے زیادہ ستر کی اہمیت ہے۔ وہ عورت اور مرد دونوں کو جسم کے وہ تمام حصے چھپانے کا حکم دیتا ہے جن میں ایک دوسرے کے لیے صنفی کشش پائی جاتی ہے۔ عریانی ایک ایسی ناشائستگی ہے جس کو اسلامی حیا کسی حال میں بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ غیر تو غیر اسلام اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ میاں اور بیوی ایک دوسرے کے سامنے برہنہ ہوں۔

اذا اتی احدکم اھلہ فلیستترو لا یتجرد تجرد العیرین (ابن ماجہ۔ باب الستر عند الجماع)	جب تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس جائے تو اس کو چاہیے کہ ستر کا لحاظ رکھے۔ بالکل گدھوں کی طرح ننگا نہ ہو جائے۔
قالت عایشہ ما نظرت اِلیٰ فرج رسول اللہ صلعم قط۔ (شمائل الترمذی۔ باب ماجاءَ فی حیاء رسول اللہ صلعم)۔	حضرت عایشہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی برہنہ نہیں دیکھا۔

اس سے بڑھ کر شرم و حیا یہ ہے کہ تنہائی میں بھی عریاں رہنا اسلام کو گوارا نہیں۔ اس لیے کہ اللہ احق ان یستحیی منہ "اللہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ اس سے حیا کی جائے"۔ (ترمذی باب حفظ العورۃ)۔ حدیث میں آتا ہے کہ:۔

اِیَّاکم والتعری فان معکم من لا یفارقکم الا عند الغائطِ وحین یفضی الرجل الی اھلہٖ۔ فاستحیوھم واکرموھم (ترمذی۔ باب ماجاء فی الاستتار عند الجماع)	خبردار کبھی برہنہ نہ رہو کیونکہ تمہارے ساتھ خدا کے فرشتے لگے ہوئے ہیں جو تم سے جدا نہیں ہوتے بجز ان اوقات کے جن میں تم رفع حاجت کرتے ہو یا اپنی بیویوں کے پاس جاتے ہو۔ لہٰذا تم ان سے شرم کرو اور ان کی عزت کا لحاظ رکھو

اسلام کی نگاہ میں وہ لباس درحقیقت لباس ہی نہیں جس میں سے بدن جھلکے اور ستر نمایاں ہو۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نساءٌ کاسیات عاریات ممیلات مایلات رؤسھن کالبخت المائلة لایدخلن الجنة ولایجدن ریحھا (مسلم۔ باب النساء الکاسیات العاریات)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو عورتیں کپڑے پہن کر بھی ننگی ہوں اور دوسروں کو رجھائیں اور بختی اونٹ کی طرح ناز سے گردن ٹیڑھی کرکے چلیں وہ جنت میں ہرگز داخل نہ ہوں گی بلکہ اس کی خوشبو بھی نہ پائیں گی۔

یہاں استیعاب مقصود نہیں۔ ہم نے صرف چند مثالیں اس غرض سے پیش کی ہیں کہ ان سے اسلام کے معیار اخلاق اور اس کی اخلاقی اسپرٹ کا اندازہ ہو جائے۔ اسلام سوسائٹی کے ماحول اور اس کی فضا کو فحشاء و منکر کی تمام تحریکات سے پاک کر دینا چاہتا ہے۔ ان تحریکات کا سرچشمہ انسان کے باطن میں ہے۔ فحشاء و منکر کے جراثیم وہیں پرورش پاتے ہیں، اور وہیں سے اُن چھوٹی چھوٹی تحریکات کی ابتدا ہوتی ہے جن کو جاہل انسان خفیف سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے، مگر حکیم کی نگاہ میں دراصل وہی اخلاق اور تمدن و معاشرت کو تباہ کر دینے والی خطرناک بیماریوں کی جڑ ہیں۔ لہٰذا اسلام کی تعلیم اخلاق باطن ہی میں حیا کا اتنا زبردست احساس پیدا کر دینا چاہتی ہے کہ انسان خود اپنے نفس کا احتساب کرتا رہے، اور برائی کی جانب ادنیٰ سے ادنیٰ میلان بھی اگر پایا جائے تو وہ اس کو محسوس کرکے آپ ہی اپنی قوت ارادی سے اس کا استیصال کر دے۔ (باقی)

مطبوعات

التعوذ فی الاسلام ۔ تالیف مولانا محمد طاہر صاحب قاسمی۔ قیمت غیر مجلد ۸؍۔ مجلد ۱۲؍۔ کتبخانہ مطبع قاسمی۔ دیوبند۔

یہ سورۂ فلق اور سورۂ ناس کے مضامین کی ایک عجیب و نادر تشریح ہے۔ ان دونوں سورتوں میں حق تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو اور ان کے واسطہ سے تمام اہل ایمان کو بتایا ہے کہ جس قدر شرور و آفات اس دنیا میں پائے جاتے ہیں ان کا پیدا کرنے والا کوئی غیر نہیں ہے بلکہ خود اللہ تعالیٰ ہے۔ لہٰذا ان سے بچنے کے لیے تم کو کسی دوسری طاقت سے پناہ مانگنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ ہی کی پناہ مانگو اور اسی کی پناہ تمہارے لیے مفید ہو سکتی ہے۔ پھر جملہ شرور مخلوقات (شَرِّ مَا خَلَقَ) کو چار اقسام پر تقسیم کیا ہے۔ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ، شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ، شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ اور شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ۔ ان چاروں شرور سے پناہ دینے والا وہی ہے جو رب الفلق ہے، رب الناس ہے، ملک الناس ہے اور اِلٰہ الناس ہے۔ مؤلف نے بڑی خوبی کے ساتھ ان شرور میں سے ایک ایک شر کی حقیقت بیان کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ہر ایک شر سے بچنے کا ذریعہ تعوّذ ہے۔ پھر تعوذ کے لیے خاص طور پر اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت اور صفتِ ملکیت اور صفتِ الوہیت کا ذکر جو کیا گیا ہے، اسکی حکمت کے بیان میں انہوں نے بڑی بڑی نکتہ آفرینیاں کی ہیں جو دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ دوران بحث میں بہت سے ضمنی مباحث بھی آگئے ہیں جنمیں علم و حکمت اور تدبّر اور تحقیق کی شان جگہ جگہ نمایاں ہے لیکن بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں تحقیق کی

ضرورت محسوس ہوتی ہے مثلاً شرّ النفّٰثٰت فی العقد کے معنی کو صرف سحر کے معنی میں محصور کر دیا گیا ہے حالانکہ اس کے دوسرے معنی بھی ہیں اور ان کی طرف بھی اشارہ ضروری تھا۔ پھر سحر کی حقیقت اور اس کی تاریخ اور اس کے اثرات کے متعلق مولف نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی نہ تو اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق ہے اور نہ علمی تحقیق کے لحاظ سے کوئی بلند پایہ چیز ہے۔ کواکب و سیارات میں مؤلف نے طبیعی تاثیرات کے علاوہ روحانی و باطنی تاثیرات بھی ثابت کی ہیں جو محل نظر ہیں۔ زیادہ بہتر ہوتا کہ اوہام باطلہ کو نظر انداز کرکے ان امور کی حقیقت پر خالص اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کی جاتی۔ سب سے زیادہ جو چیز ہم کو کھٹکی وہ یہ ہے کہ حقیقت تعوذ اور طریق تعوذ کے باب میں فاضل مؤلف بھی عام غلط فہمی کے شکار ہو گئے ہیں۔ دراصل یہ متاخرین کی پست خیالی اور حقائق سے منحرف ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ آیات قرآنی اور اسماء الٰہی کی روح کو چھوڑ کر صرف الفاظ کی تاثیرات میں غلو کیا گیا اور ان کے نقوش اور عملیات اور زبانی ورد کو ظہور عجائب اور حصولِ مقاصد کا ذریعہ بنا لیا گیا۔ مسلمانوں کی عملی اور اخلاقی قوتوں کے لیے یہ ذہنیت ایک طرح کی افیون ثابت ہوئی ہے۔ اسی چیز نے ان کو ایک بے عمل اور اوہام پرست قوم بنایا ہے۔ اسی نے قرآن کی انقلاب انگیز تعلیم سے ان کا رشتہ توڑا ہے۔ اسی نے تدبر فی القرآن اور عمل بالقرآن کے ذوق کو فنا کرکے مسلمانوں میں یہ جوگیانہ ذوق پیدا کیا ہے کہ وہ اسبابِ طبیعی سے کام لینے اور قانونِ فطرت کے مطابق جد و جہد کرنے کے بجائے صرف نقوش اور اوراد سے کام لیتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ان کے تمام مقاصد فوق الطبیعی صورتوں سے پورے ہوا کریں۔ اب ان کی زبان میں عمل کے معنی اُس عمل کے نہیں ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے کیا تھا، بلکہ عمل صرف یہ رہ گیا ہے کہ چند مقررِ اوقات میں چند مقرر شرائط کے ساتھ ایک خاص وظیفہ جپ لیا جائے اور یہ امید رکھی جائے کہ اس وظیفہ

کی طاقت سے پہاڑ ٹل جائیں گے، خزانے ابلیں گے، خوارق عادت ظاہر ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ ان کی خاطر سے اپنی سنّت کو بدل دے گا۔ ذِکر اور تعوذ اور عزیمت اور دوسری اسلامی اصطلاحات کے مفہوم بھی اسی طرح الٹ دیے گئے ہیں، اور انکی جان نکال کر یہی "افیونیت" اُن میں بھر دی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ فاضل مؤلف بھی اس کے اثر سے نہ بچ سکے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جملہ شرور و آفات سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے سورۂ فلق اور سورۂ ناس کو ایک "نسخہ" کے طور پر نازل فرمایا ہے اور اس کا مقصد بس اتنا ہے کہ جب کوئی آفت آئے تو معوذتین کو پڑھ کر دم کیا جائے، پانی پر پھونک کر پلایا جائے اور تعویذ میں باندھ کر لٹکا دیا جائے۔ ہم الفاظ قرآنی کی برکت اور اسمار الٰہی کی تاثیرات کے منکر نہیں ہیں۔ بلاشبہ ان میں بے شمار فوائد ہیں، مگر یہ ہماری بدقسمتی ہوگی اگر ہم مغز کے اصلی اور عظیم ترین فوائد کو چھوڑ کر صرف قشر کے ضمنی فوائد کو اصل سمجھ لیں۔ اصل چیز تو وہ علم ہے جو معوذتین سے ہم کو عطا کیا گیا ہے، اور اصلی تعوذ یہ ہے کہ یہ علم کمال درجہ تصدیق و یقین کے ساتھ ہمارے دل میں بیٹھ جائے اور جملہ شرور و آفات کے مقابلے میں ہم حق تعالیٰ کی طرف اس طرح رجوع کریں کہ کسی طاقت کا خوف ہمارے پاس نہ پھٹکے اور غیر اللہ سے پناہ مانگنے کا ادنیٰ سے ادنیٰ خیال بھی نہ آنے پائے۔ معوذتین کا ورد اگر اس علم و یقین کے ساتھ ہو اور ہر بار پڑھنے کے ساتھ یہ کیفیت بڑھتی چلی جائے تو مسلمان کے قلب و روح میں وہ طاقت پیدا ہوگی کہ کسی شرِ ما خلق کا اثر اس پر کارگر نہ ہوگا۔ یہ ان دونوں صورتوں کی روح ہے اور اسی روح کو نمایاں کرنے کی ضرورت تھی۔ عملیات اور نقوش و اوراد کی غذا تو مسلمانوں کو بہت مل چکی ہے۔ اس صنف کی اب کوئی ضرورت باقی نہیں رہی (ا-م)۔

التحریر فی الاسلام | تالیف مولٰنا محمد طاہر صاحب قاسمی۔ قیمت ۸ ر کتب خانۂ مطبع قاسمی۔ دیو بند (ضلع سہارنپور)۔

فاضل مؤلف نے اس رسالہ میں آیۂ کریمہ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کی تفسیر ایک نئے انداز میں کی ہے۔ بحث کا مرکز صرف لفظ وَانْحَرْ ہے۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے فاضل موصوف نے قربانی کی حکمت و ضرورت اور اسکے نفسی و روحانی فوائد پر بڑی خوبی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ انداز بیان خطیبانہ اور صوفیانہ ہے۔ دلائل زیادہ تر خطابیات کے قبیل سے ہیں اور نکتہ آفرینی میں اہل تصوف کے طریقہ کا اتباع کیا گیا ہے۔ اہل ایمان کو اطمینان بخشنے کے لیے تو بلاشبہہ یہ طرز بحث بہت مفید ہے، لیکن منکرین اور مشککین کے شبہات و اعتراضات کو رفع کرنے میں یہ کچھ بھی کارآمد نہیں۔ ان کے لیے اسلوب بیان منطقی ہونا چاہیے اور دلائل کا انتخاب ایسے مواد سے کرنا چاہیے جو یقینیات یا مسلّمات کے قبیل سے ہو۔ قربانی پر اعتراض کرنے والے تین قسم کے ہیں:۔

ایک وہ جنہیں نفس گوشت خوری ہی پر اعتراض ہے۔

دوسرے وہ جو گوشت خوری کو تو جائز رکھتے ہیں، مگر "قربانی" کو عبادت اور ذریعۂ تقرب الی اللہ تسلیم کرنے میں انھیں تامل ہے۔

تیسرے وہ جن کو قربانی پر اقتصادی حیثیت سے اعتراض ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ عیدالاضحیٰ میں مسلمانوں کا لاکھوں روپیہ جو قربانی پر "ضائع" ہوتا ہے اس کو خیرات و صدقات کے زیادہ مفید کاموں میں کیوں نہ صرف کیا جائے۔

ان معترضین کے شبہات کو رفع کرنے کے لیے وہ طرز استدلال کسی طرح مفید نہیں جس کو فاضل مؤلف نے اختیار کیا ہے، اور آج کل ضرورت انہی شبہات کو رفع کرنے کی ہے۔ کیا ہی بہتر ہو کہ ایک رسالہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بھی لکھ دیا جائے۔ (ا-م)۔

الحق الصراح | تالیف جناب مولوی عبدالحق صاحب مدرس عربی ہائی اسکول بہاول گڑھ (ریاست بہاولپور)، قیمت درج نہیں۔ مولف سے طلب کیا جا سکتا ہے۔

یہ ۴۴ صفحات کا مختصر رسالہ اس غرض کے لیے لکھا گیا ہے کہ نکاح خوانوں کو مسائل نکاح وطلاق کے ضروری جزئیات سے واقف کردیا جائے۔ عام طور پر نکاح خواں حضرات (جو اب "قاضی" کہلانے لگے ہیں) نکاح وطلاق کے ابتدائی مسائل تک سے ناواقف ہوتے ہیں اور اس ناواقفیت کی وجہ سے نکاح پڑھاتے میں اکثر ایسی غلطیاں کرجاتے ہیں جن سے بہت سی شرعی وقانونی پیچیدگیاں پڑجاتی ہیں۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لیے مؤلف نے فقہ حنفی کے مطابق جملہ ضروری مسائل کو نہایت سہل انداز بیان میں مرتب کردیا ہے۔ نکاح خوانوں کے علاوہ عامۃ المسلمین کے لیے بھی یہ رسالہ مفید ہے۔

بعض مسائل ایسے بھی ہیں جن پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ مؤلف نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر متعدد ایسے احکام شریعت کو معطل کردیا ہے جن کے اجراء کے مواقع موجودہ حکومت کے تحت ہمیں حاصل ہیں۔ دارالحرب کا یہ تصور اصلاً غلط ہے۔ شریعت کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ آپ دارالحرب میں قیام بھی کریں اور پھر جو احکام اسلامی نافذ ہوسکتے ہیں ان کو بھی محض اس لیے معطل کردیں کہ کتب فقہ میں دارالحرب کی جو تعریف لکھی ہے وہ اس پر صادق آگئی ہے۔ دراصل شارع کا منشا یہ ہے کہ آپ یا تو وہاں سے ہجرت کریں یا نہیں تو احکام کی تنفیذ کی کوشش کرکے اسے دارالاسلام بنائیں۔

کافرہ اگر شوہر والی ہو اور مسلمان ہوجائے تو مؤلف نے اس کے لیے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ وہ تین حیض یا تین ماہ تفریق کے لیے گذارے، پھر مزید تین حیض یا تین ماہ عدت میں صرف کرے پھر اس کا نکاح ہوسکتا ہے لیکن یہ درست نہیں۔ تفریق کے لیے تین حیض یا تین ماہ گذارنے کا حکم اس جگہ کے لیے ہے جہاں کوئی حاکم اسلامی قانون کے مطابق تفریق کا حکم دینے والا موجود نہ ہو۔ ہندوستان کی یہ حالت نہیں ہے۔ یہاں ایک نومسلم عورت عدالت میں دعوی کرکے حکم تفریق

حاصل کر سکتی ہے۔ اگر باقاعدہ قانونی تفریق کے بغیر وہ تین طہر گذار کر نکاح کرلے تو قانون ملکی کے مطابق اس پر ازدواج مکرر کا مقدمہ قائم ہو جائیگا۔ لہٰذا قانون اسلامی اور قانون ملکی دونوں کی رو سے یہ ضروری ہے کہ عدالت سے تفریق کا حکم حاصل کیا جائے۔ پھر تفریق کے بعد عدت گذارنا امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہٗ کی رائے میں ضروری نہیں اِلّا یہ کہ عورت حاملہ ہو۔ حالات زمانہ کو دیکھتے ہوئے اسی رائے پر فتویٰ ہونا چاہیے۔ صاحبین کے فتویٰ پر عمل کرنا موجودہ زمانے میں موجب فتنہ ہے۔ کیونکہ ایک عورت جو اپنے اولیا اور اپنے شوہر سے الگ ہو کر مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہوئی ہے اس کو تفریق کے بعد تین مہینے تک بے شوہر رہنے پر مجبور کرنا خطرے سے خالی نہیں۔

لعان کے مسئلہ میں مؤلف نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں لعان نہیں ہے، کیونکہ لزوم لعان کے لیے تہمت زنا کا دارالاسلام میں ہونا شرط ہے، اور ہندوستان دارالاسلام نہیں ہے۔ یہ مسئلہ لکھتے وقت مؤلف کو غور کرنا چاہیے تھا کہ اس سے کروروں مسلمانوں کی عظیم الشان آبادی میں کتنے فتنوں کا دروازہ کھلتا ہے۔ یہاں تو ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ محمڈن لا میں لعان کی دفعات کا اضافہ کیا جائے، کیونکہ تہمت زنا یا نفی ولد کے بعد زوجین کا ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ رہنا سخت مفاسد کا موجب ہوجاتا ہے۔ مگر فاضل مؤلف دارالحرب کی ایک اصطلاحی دشواری پیدا کرکے اس دروازے کو ہمیشہ کے لیے کھلا رکھنے کا سامان کر رہے ہیں۔

مسائل لعان میں مؤلف نے صرف یہ لکھدیا ہے کہ ملاعنت کے بعد حاکم تفریق کردے۔ اس کے ساتھ یہ بھی بیان کرنا ضروری تھا کہ ملاعنت سے مہر ساقط نہیں ہوتا (ا-م)۔

The Great Prophet تالیف فضل کریم خاں صاحب درانی بی۔ اے ایڈیٹر اخبار رُتھ قیمت ۲ار مفت تقسیم کرنے کے لیے پانچ نسخوں کی قیمت (ایک) روپیہ۔ پچاس نسخوں کی قیمت ۲/۲ روپیہ

۱۰۰ نسخوں کی قیمت ۵۰ روپیہ تبلیغ لٹریچر کمپنی۔ نمبر ۶۶ ریلوے روڈ۔ لاہور۔

انگریزی زبان میں سیرت پاک پر ایک مختصر کتاب ہے جس کو نہایت سادہ اور موثر زبان میں لکھا گیا ہے۔ انگریزی خواں غیر مسلموں کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے ابتدائی طور پر روشناس کرانے کے لیے ایک مفید چیز ہے اور اس قابل ہے کہ مسلمان اپنے غیر مسلم دوستوں کو ہدیۃً نذر کریں اسی لیے ناشرین نے زیادہ تعداد میں خریدنے والوں کے لیے خاص رعایت رکھی ہے۔ (ا-م)۔

کلام جوہر صفحات ۱۴۱۔ قیمت ۸/ ۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ۔ دہلی۔

یہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کے کلام کا مجموعہ ہے جس کو نئی ترتیب کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ ابتدا میں جناب مولٰنا عبدالماجد دریابادی مدیر "صدق" کا لکھا ہوا مقدمہ ہے جس میں عقیدت ومحبت کے ساتھ شاعر کی شخصیت اور اس کے کلام کی اصلی خوبیاں نمایاں کی گئی ہیں۔ مولانا محمد علی مرحوم کے دل ودماغ کو قدرت نے شعروادب کا نہایت پاکیزہ مذاق عطا کیا تھا جس سے انہوں نے زیادہ تر اپنے مضامین اور تقریروں میں کام لیا۔ ان اصلاحی اور مفید کاموں سے جو شعریت بچی وہ کبھی کبھی شعرگوئی میں بھی صرف ہوتی رہی۔ مرحوم کی تمام شاعری سوز وگداز سے لبریز ہے اس میں ہوسناکی کے چٹخارے اور شہوانی جذبات کو بھڑکانے والے محرکات قطعاً ناپید ہیں۔ کمر کی لچک اور باہوں کے لوچ کے بجائے تلوار کی لچک اور پھانسی کے پھندے کا لوچ پایا جاتا ہے۔ شاعرانہ تخیل پر اسلامی تخیل غالب ہے۔ آغاز عمر کے کلام میں یہ رنگ ہلکا تھا۔ جوں جوں امتداد عمر کے ساتھ جذبۂ اسلامی بڑھتا گیا جوہر کا راستہ دوسرے شعرائے سے الگ ہوتا چلا گیا ـــــ وہ نہ تو زمانہ کی نامساعدت پر ماتم کرتے ہیں نہ فلک کج رفتار کو کوستے ہیں۔ ان کا نظریہ "تسلیم ورضا" ہے۔ قید خانہ کی چار دیواری میں بیٹھ کر کس اطمینان سے کہتے ہیں

ہوں بے ہراس یہ مجھے رقص کی جگہ ڈر ہو وہاں کہ تیری حکومت جہاں نہ ہو

ان کا جذبۂ عشق رسول ہر مسلمان کے لیے قابل رشک ہے۔ اشعار میں جا بجا اس گراں قدر جذبہ کا اظہار کیا ہے۔ ایک غزل کا مقطع ہے۔

نہیں معلوم کیا ہو حشر جو ہر کا پر اتنا ہے کہ ہاں نام محمد مرتے دم ورد زباں پایا

کلام میں تغزل کی خوش گوار چاشنی اور زبان کی شیرینی بمقدار وافر پائی جاتی ہے جن کو شعر کا چسکا ہو وہ عریاں نظموں اور فحش غزلوں کے بجائے اس آب کوثر سے اپنی پیاس کیوں نہ بجھائیں۔ (م۔ ق)

سید البشر تالیف مولوی ابو سعید عبد الرحمن صاحب فرید کوٹی۔ ضخامت ۸۰ صفحات قیمت ۲؍

ملنے کا پتہ: میاں سعید احمد خان۔ دروازہ نندیانی، ریاست فرید کوٹ (پنجاب)۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت بائبل کے عہد عتیق اور عہد جدید میں جو بشارتیں مذکور ہیں عربی فارسی اور اردو میں ان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھنے کی گنجائش ہے۔ سید البشر کے مصنف نے ایک نئے اسلوب پر پچاس بشارتیں انتخاب کر کے ان کو سیرت پاک سے توفیق و تطبیق دی ہے۔ شروع میں مسیح علیہ السلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرۂ طیبہ نقل کیا ہے اور بتایا ہے کہ مسیح علیہ السلام کے نسب کے بارے میں انجیل متی اور انجیل لوقا میں کس قدر اختلاف ہے۔ لوقا نے مسیح کے فرضی باپ یوسف نجار سے زروبابل تک ۲۰ واسطے بتائے ہیں، اور متی صرف ۱۱ واسطے بیان کرتا ہے۔ بخلاف اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرۂ نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام تک متفق علیہ ہے۔ طبری اور ابن سعد وغیرہم نے جو شجرے نقل کیے ہیں ان میں ایک نام کا بھی اختلاف نہیں۔ (ا۔ خ)۔

مکتبۂ علمیہ

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۲۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہونگی انکو پرچہ قیمتاً دیا جائیگا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام طویل مدت کے لیے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیے ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹرڈ نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز

اشاعت کے لیے مضامین اور حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے۔

منیجر ترجمان القرآن بدرالدین بلڈنگ نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

(طابع و ناشر سید ابوالاعلیٰ مودودی)

(مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن)

اُردو زبان کی ایک پرشکوہ کتاب

تمدن عرب

جو مدتوں سے نایاب تھی پہلے اڈیشن ۱۸۹۸ء

کی صفحہ بہ صفحہ جامع خصوصیات کے ساتھ طبع ہو رہی ہے (۱۴۵) امیرکن بلاک (۶۵۱) صفحے اعلیٰ کاغذ
نفیس چھپائی، بہترین سنہری جلد فرانس کے مایۂ ناز مورخ ڈاکٹر گستاؤلی بان کی اصل کتاب کا ترجمہ

مولوی سید علی بلگرامی مرحوم کا بے مثل علمی کارنامہ

جس کی پچاس روپیہ قیمت تھی مگر اب ایک سو روپیہ میں بھی نہیں مل سکتی تھی

اعلیٰحضرت فرمانروائے دکن (مدظلہ) کے

جشن سیمین کی شادمانی میں غرۂ ذی حجہ ۱۳۵۴ھ تک شائع ہو جائے گی

پیشگی رعایتی قیمت بیس روپے بعد طبع پچیس روپے

جامعہ عثمانیہ کی جملہ مطبوعات ہر قسم کی نادر روزگار کتابوں کے لئے

سید عبد القادر

پبلشر گورنمنٹ ایجوکیشنل پبلشر و پروپرائٹر اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن کا (پتہ یاد رکھیں)